طلوع و غروب



طلوع و غروب

احمد ندیم قاسمی

پیرزادہ محمد حیات قاسمی

کے نام

اس دلاویز رات کی یاد میں

جب ہم نے اپنے گاؤں کے مغرب میں ایک

اندھی گہری کھاڑی میں چھپ کر سوئے ہوئے جنگلی

کبوتروں پر اندھیرے میں فائر کیے تھے اور جب

واپسی پر ہم نے اپنی اس عجیب و غریب حرکت کے

حق میں صرف یہ دلیل پیش کی تھی کہ۔

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے

لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے

ندیم

ترتیب

دیباچہ

چند احباب نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں وسطی اور مشرقی پنجاب کے دیہات کی زندگی کے متعلق بھی کہانیاں لکھوں کیونکہ ان کے خیال میں میرے افسانے شمال مغربی پنجاب کی سطح مرتفع اور مغربی پنجاب کے "تھلوں" میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور ان میں مقامی رنگ کی اتنی افراط ہے کہ وسطی اور مشرقی پنجاب کے دیہات میں رہنے والے ان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ شمال مغربی پنجاب سے زیادہ میں نے دنیا کے اور کسی حصہ کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے پنجاب کے دیگر اضلاع کو دیکھنے کا موقع ملا ہے' میں نے دیہی زندگی کے بنیادی اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں پایا۔ گاؤں میرے افسانوں کے لیے صرف پس منظر کا کام دیتا ہے اور اس میں رہنے بسنے والے انسان میرے افسانوں کے کردار ہیں۔ انسانی دل کی دھڑکن دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہے' دکھ سکھ کا قانون ہندوستان کے دیگر حصوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی وہی ہے جو ان دیہات میں رائج ہے۔ پہاڑوں

کی پگڈنڈیوں اور ریگزاروں کے ٹیلوں کا ذکر کرنے سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان پہاڑوں اور ریگزاروں میں رہنے والے نسلِ آدم کی بجائے کسی دوسرے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر جس ماحول کے متعلق لکھنے والے کا مطالعہ نسبتاً گہرا ہے اسے پسِ پشت کیوں ڈال دے اور ان دیہات کے متعلق کیوں لکھے جن کی بولی ٹھولی اور رسم و رواج سے وہ ایک حد تک ناواقف ہے۔ ضروری امر ہے کہ وہ اس طرح ادب کا پورا حق ادا نہ کر سکے گا اور صنوبروں کو میدانوں میں اور کھجوروں کو پہاڑوں پر لہراتا دکھا دے گا۔ مقامی رنگ پیش کرنے کی بنا پر اگر دنیا کے ہر ادیب اور شاعر کو گردن زدنی قرار دیا جائے تو وہ کونسا "خوش نصیب" ہے جو بچ نکلے گا۔ ٹامس ہارڈی کے ناول جزائر برطانیہ کے ایک خاص حصے میں محدود رہ کر بھی اپنے اندر کائناتی جاذبیت رکھتے ہیں اور ٹیگور کی کہانیاں اور نظمیں پرانے ہندو کلچر کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ کے لیے بھی سرمایۂ فکر و نشاط ہیں!

میں نے دیہات کے موضوع پر صرف اس لیے قلم اٹھایا تھا کہ پنجاب کے دیہات کو صحیح رنگوں میں پیش کرنے والا مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ جن چند نفوس نے اس طرف توجہ کی (اور مجھے اعتراف ہے کہ ان کی نیت میں خلوص تھا) وہ دیگر بے شمار مصروفیتوں میں گھر کر اپنے بھائیوں سے غافل ہو گئے یا صحیح الفاظ میں غافل کر دیئے گئے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی اصطلاحوں سے بلند ہو کر میں نے اپنے غیور، غریب اور محنتی بھائیوں کے احساسات و جذبات کو کہانیوں کی صورت میں پیش کرنے کی سعی ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں یا ناکام۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی ہے کہ میں نے ان بے زبانوں کی نمائندگی کی ہے جن کی زندگیاں محبوس ہیں اور جن کے لبوں پر رواج اور قانون نے مہر لگا رکھی ہے۔ بلاشبہ زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کا قرض ادیبوں پر عائد ہوتا ہے لیکن ان

فرائض کی تقسیم کیوں نہ کر لی جائے، شہری شہروں کے متعلق لکھیں اور دیہاتی دیہات کے متعلق! ایک پنجابی اگر پنجاب میں رہتے ہوئے یوپی، بہار، بنگال یا دکن کے باشندوں کی زندگیوں کا جائزہ لینے لگے اور اگر ایک دکنی، سرحد کے پٹھانوں کے متعلق لکھنے بیٹھ جائے تو گو مقصد نیک ہے لیکن کامیابی موہوم!

جس شخص نے چوپالوں پر بیٹھ کر غریب کسانوں کے ساتھ حقے کے کش لگائے ہوں اور چرواہوں کے ہمراہ دور افتادہ گھاٹیوں اور ویران میدانوں میں گھومتا پھرا ہو، وہ ٹھنڈی سڑک کے آس پاس بکھرے ہوئے بنگلوں کی اندرونی زندگی کے متعلق کیا خاک لکھے گا اور جو شخص گونجتے ہوئے ایوانوں میں نرم و گداز صوفوں پر بیٹھنے کا عادی ہو اور کانٹا چھری کے بغیر جسے پیٹ بھرنا اجیرن ہو جائے، وہ ننگ دھڑنگ دہقانوں کی پھٹی ہوئی ایڑیوں، کھردری انگلیوں اور پھڑپھڑاتے ہوئے چیتھڑوں کا تجزیہ کیسے کر سکے گا؟

کئی حضرات کو شکوہ ہے کہ اول تو میں "رنگینیوں" سے کتراتا ہوں اور اگر اپنی شاعرانہ افتادِ طبع کے زیرِ اثر اس طرف جھکوں بھی تو آخر کار پھر انہیں اندھیروں میں ڈوب جاتا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں سراپا "رنگین" ہونی چاہئیں!

میں انہیں صرف یہی کہوں گا کہ ——— "میں نے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے آہوں کے دھوئیں اٹھتے دیکھے ہیں۔ میں نے موت کی چڑیلوں کو تیرہ نصیب مریضوں کے سرہانے دانت کچکچاتے اور انگلیاں چٹخاتے دیکھا ہے۔ میں نے زندگی کی نعش کو گلتے سڑتے دیکھا ہے۔ میں نے پھول کی نرم پتیوں پر کانپتے ہوئے اوس کے موتیوں کو اس قدر غور سے نہیں دیکھا جتنا گرد آلود پلکوں میں اٹکے ہوئے دھندلے آنسوؤں کو ———! میں نے کلکاریاں مارتے ہوئے ان امیر بچوں کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جو گدگدے ہنڈولوں میں جھولتے رہے بلکہ میں نے غریبوں کی اس روتی اور بلکتی ہوئی اولاد کو نہایت قریب سے دیکھا

ہے جنکی دھجیوں سے بدبو آتی ہے' جس کی آنکھوں سے کئی دن کا عفونت خیز میل چپکا رہتا ہے اور جس کی ہنسی میں بھی مجھے غم و اندوہ کے بھتنے تالیاں بجاتے نظر آتے ہیں!——— اور پھر تم مجھ سے رنگ و بو کے طلبگار ہو۔ تم کہتے ہو میں اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں۔ لیکن اے روشنیوں میں رہنے والو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اسی اندھیرے میں تمہاری طرح کے منہ ناک اور ہاتھ پیر رکھنے والے لاتعداد انسان ازل سے ٹاک ٹوئے مار رہے ہیں' لیکن انہیں تمہارے دربار سے روشنی کی ایک کرن تک نصیب نہیں ہوئی!"

اس لیے میری کہانیوں کے پس منظر سے نامانوس حضرات انہیں صرف اس نظر سے پڑھیں کہ اسی سرزمین میں ایک ایسی جماعت بھی آباد ہے جو باسی روٹی اور پیاز سے پیٹ بھر کر بھی طاقتور رہ سکتی ہے۔ جس کے پسینے کی کمائی کو کوڑیوں کے مول خرید کر اس پر مکھن اور شکر چڑھا کر وہ پر تکلف ریستورانوں میں داد عیش دیتے ہوئے سیاسیات عالم پر طویل بحثیں کرتے ہیں اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کے حکم کا تابع ہے لیکن جسے شرافت اور عصمت کی حفاظت کے لیے اپنا سر کٹا دینے میں کوئی باک نہیں ہوتا!!

لاہور

۲۷/ دسمبر ۱۹۴۲ء

احمد ندیم قاسمی

طلوع و غروب

طلوع و غروب

سنہرا غبار

ٹیلوں پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور دور کھجوروں کے ایک جھنڈ میں کوئی پنچھی سہمی سہمی تانیں اڑا رہا تھا۔ میں اس صحرا میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ میرا بوڑھا ملازم سو گیا تھا اور چونکہ پردیس میں مجھے نیند بہت کم آتی ہے اور صحراؤں کی چاندنی راتیں سونے کے لیے نہیں بلکہ جاگنے کے لیے ہوتی ہیں' اس لیے پہلے تو میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا مگر جب کھجوروں کے جھنڈ میں کسی پرندے کی دکھی سہمی سہمی تانیں سنیں اور پھر ان میں کسی بھاگتی ہوئی خوفزدہ دوشیزہ کے گھنگریالے بالوں کی طرح لہراتا دیکھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کتے اپنی دمیں ہلانے لگے اور طلائی ریت ان کی دموں کی ہر حرکت پر اڑنے لگی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر میں نے چار سو نگاہیں دوڑائیں۔ اکا دکا کھجوروں کے آسیبی سائے اور سائیں سائیں کرتی ہوئی خاموشی کے سوا تنہائی کے اس لق و دق براعظم میں اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میں ٹھنڈی ریت کو مٹھیوں میں دبا کر اسے ہولے ہولے نیچے گرانے لگا۔ ریت کے ننھے ننھے مینار سے ابھر آئے اور میں سوچنے لگا کہ اگر خدا نے زمین کا اس قدر طویل اور

عریض ٹکڑا ریت اور صرف ریت کے لیے وقف کیا ہے تو آخر اس کا مقصد!
—— یوں کیوں نہ ہوا کہ یہاں سرسبز اور شاداب کھیت ہوتے۔ گیہوں کی
سنہری بالیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ایک انداز بے نیازی سے اپنی گردنیں
خم کر دیتیں اور سارا منظر کوؤں کی روں روں اور چشموں کے دبے دبے نغموں
سے لبریز ہوتا —— یا یوں کیوں نہ ہوا کہ یہاں اونچے اونچے پہاڑ ہوتے، جن
پر بلند صنوبروں کے جنگل ہوتے۔ ننھی ننھی ندیاں چٹانوں پر سر پٹختی، جھاگ
کے بادل اڑاتی زخمی ناگنوں کی طرح لہراتی پھرتیں اور ڈھلانوں پر الھڑ واہیاں
پتلی پتلی انگلیوں میں موٹی موٹی بنسریاں تھامے گلابی ہونٹوں کے ایک ذرا سے
مس سے فضاؤں میں موسیقی کا رس گھولتیں —— یا یوں کیوں نہ ہوا کہ
یہاں بڑے بڑے شہر —— ! میرے خیالات کی پرواز اچانک رک گئی اور
چاندنی کے سیمیں اندھیرے میں مجھے اونٹوں کی گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی صدائیں
سنائی دیں۔ خاموشی کے اس سمندر پر ان سریلی آوازوں کا سفینہ تیرتا ہوا آیا
اور میرے احساسات کے ساحل سے ٹکرانے لگا اور اچانک میرے ذہن پر
پرانے زمانے کے ایک قافلے کے نقوش ابھرنے لگے —— اونٹوں کی دور
افق میں گم ہوتی ہوئی قطار —— حدی خواں —— ساربان —— محملوں
میں بیٹھی ہوئی حسین دوشیزائیں جن کے پھول سے کانوں کی لووں میں چاندی
کے بُندے اونٹ کے ہر ہچکولے پر پھڑکتے تھے —— اور جن کے ابھرے
ہوئے سینوں پر دبی ہوئی امنگیں سہمے سہمے گیت بن کر محمل کے پردوں کے آس
پاس گھومتی رہتی تھیں۔

کھجوروں کے جھنڈ میں بے نام پرندے نے ایک تان اڑائی اور
خاموشی کے سینے پر جیسے ایک تیز نشتر چلا دیا۔ قافلہ ہولے ہولے قریب آتا گیا۔
اونٹوں اور سارہانوں کے خطوط واضح ہوتے گئے اور اب کجاووں میں کبھی کبھی
ایک چمک سی بھی نظر آجاتی تھی جو شاید چاند کی کرنوں کے، دوشیزاؤں کے

بُندوں کو چومنے سے پیدا ہوتی تھی۔ میرے شکاری کتے زور زور سے بھونکتے
ہوئے اونٹوں کی طرف لپکے۔ میں انہیں روکنے کی کوشش میں ان کے ساتھ
بھاگنے لگا لیکن قافلہ کتوں کے خوف سے بے پروا آہستہ آہستہ رینگتا چلا گیا۔
پیتل کی گھنٹیاں اسی طرح منمناتی رہیں اور کسی ساربان کا یہ گیت کتوں کی کرخت
آوازوں سے لپٹتا دھندلی سنہری فضا پر تانوں کے ملائم تار پھیلاتا بدستور جاری
رہا:

اے کالی راتوں میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے والے خوفناک
بھوتو۔ میں تمہاری ہڈیوں کی چیخ اور دانتوں کی کچکچاہٹ اور
آتشیں سانسوں کے بگولوں سے ذرہ بھی نہیں گھبراتا۔ کیوں
کہ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں!

اے وسیع صحراؤں پر گرجنے والے بادلو اور کڑکتی ہوئی
بجلیو! میں جانتا ہوں کہ تمہارے خوف سے بوڑھے
درخت چیخ رہے ہیں اور کھلی فضائیں تھرا رہی ہیں۔ میں
جانتا ہوں کہ نالے چڑھنے والے ہیں اور پگڈنڈیاں مٹنے والی
ہیں۔ لیکن میں بالکل ہراساں نہیں کیوں کہ میں اپنی محبوبہ
کے ساتھ جا رہا ہوں!

اے چاندنی سے دھلے ہوئے ٹیلے پر بیٹھی ہوئی اجنبی عورت!
مجھے اپنی طرف بلانے کی کوشش نہ کر۔ میں جانتا ہوں کہ
تیرے بال ساون کی گھٹاؤں کی طرح سیاہ ہیں۔ تیری
آنکھوں میں پہاڑی جھیلوں کی سی گہرائیاں اور سیاہیاں ہیں۔
تیرے ہونٹ گلاب کی نومیدہ پنکھڑیاں ہیں۔ تیرے گال
ریشم کی طرح نرم اور شفق کی طرح نارنجی ہیں۔ تیرا سارا
جسم کنوارے نوجوانوں کے خوابوں کے مشابہ ہے۔ لیکن

میں تیرے بس میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ میں تجھ سے کہیں
اچھی محبوبہ کے ساتھ جا رہا ہوں!

ایک جگہ پر جا کر میں نے کتوں کو روک لیا اور انہیں دھتکار کر خیمے کی طرف بھگا دیا۔ اب اونٹ میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کجاووں پر بُندوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور اونٹوں کی گھنٹیاں سینکڑوں جل ترنگوں کی طرح بج رہی تھیں۔ مجھے بھی اسی ریگزار کے کسی گاؤں تک پہنچنے کی آرزو تھی۔ شکار کی دُھن میں شام پڑ گئی تھی اور رات بھر کسی گاؤں کی تلاش میں ٹیلوں پر بھٹکتے پھرنے کے بجائے میں نے یہیں خیمہ تان لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس لئے آواز دی۔ "بھئی کس گاؤں جائے گا یہ قافلہ؟"

چند ساربانوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بیک زبان بولے۔

"سوسن"

میں بھاگ کر ایک ساربان کے پاس گیا اور کہا۔ "بھئی مجھے بھی سوسن جانا ہے۔ شکار کھیلنے آیا تھا، رات پڑ گئی۔ رستہ معلوم نہ تھا۔ تم اگر میرے لئے کچھ دیر انتظار کر سکو تو میں سب سامان لے کر تمہارے ساتھ چلا چلوں۔ کل دن کو میں کس سے راستہ پوچھتا پھروں گا۔"

ساربان جس نے منڈاسے سے منہ چھپا رکھا تھا۔ بولا۔ "ہرج تو کوئی نہیں لیکن ـــــ" اور وہ کچھ دیر سوچ کر زور سے پکارا۔ "بے گلاب خاں۔ یہ ایک مسافر ہے بیچارا۔ کہتا ہے مجھے بھی سوسن لے چلو۔ کہو تو چند گھڑی یہاں دم لے لیں۔"

اور قافلے کے اگلے سرے سے آواز آئی۔ "کون ہے یہ مسافر؟"

اور ساربان نے جواب دیا۔ "کوئی شکاری ہے۔"

اُدھر سے گلاب خاں نے آواز دی۔ "ٹھہر جائیں گے، تم اس سے کہو ذرا جلدی کرے، پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ برات کو پوپھٹنے سے پہلے پہنچ جانا
چاہیے ـــــ تاروں کی چھاؤں میں!"

قافلہ رک گیا۔ گھنٹیوں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ کجاووں پر چہچہے سے سنائی دینے لگے اور میں اپنے خیمے کی طرف بھاگا۔ میرا ملازم خیمے سے باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ بولا۔ "آپ کدھر نکل گئے تھے؟ راتوں کو ان ریگستانوں میں بھوت پریت کھیلا کرتے ہیں۔ آپ کو تو اپنی جان کی کچھ پروا ہی نہیں!"

کتے میرے قدموں میں لوٹنے لگے اور میں ملازم کی پیٹھ تھپکاتے ہوئے بولا۔ "گھبراؤ نہیں۔ یہ قافلے والے یہاں ایک گاؤں سوسن میں جا رہے ہیں۔ خیمہ، پٹھو، بندوق سنبھالو اور چلو میرے ساتھ۔ بھوت پریت کا قصہ چھوڑو۔ یہ سب واہمے ہیں۔"

اب میرا ملازم تیزی سے خیمے اکھیڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "واہمہ تو نہیں آقا۔ ساری دنیا پر روشن ہے کہ ان ٹیلوں میں بہت سے شکاری آئے اور دیوانے ہو کر واپس گئے۔ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ نواب ریحان خان کا بیٹا ادھر شکار کھیلنے آیا اور جب واپس گیا تو کھویا کھویا۔ حکیموں سے مشورے کئے گئے۔ جواب ملا یہ کوئی مرض نہیں۔ بھوت پریت کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ایک اندھیری رات کو گھر سے نکل بھاگا۔ اس روز قیامت خیز آندھی آئی اور اس میں ایسا کھویا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ آپ تو میری ہر بات کا مذاق اڑا دیتے ہیں!"

انہی باتوں میں خیمہ لپیٹ لیا گیا اور ہم قافلے کی طرف بڑھے۔ ٹیلے کے دامن میں کچھ اونٹ بیٹھے ستا رہے تھے۔ کچھ گردن موڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور کئی چپ چاپ کھڑے جیسے کجاووں میں بیٹھی ہوئی دوشیزاؤں کی باتیں سن رہے تھے!

منڈاسے والا نوجوان میرے انتظار میں تھا۔ میرے پہنچتے ہی اس نے گلاب خاں کو کوچ کرنے کو کہا اور قافلہ ہولے ہولے ٹیلوں کے درمیان رینگنے لگا۔ "کہاں سے آ رہے ہیں آپ لوگ؟" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"سمن سے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم نے اپنے گاؤں کے لئے پھولوں کے سے نام کیوں چن رکھے ہیں۔ سمن' سوسن بہت پیارے نام ہیں یہ۔"

اور وہ بولا۔ "یہاں پھول نہیں ملتے نا۔ اس لئے!"

میرا ملازم بھاری خیمے کو ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے بولا۔ "یہاں پھول نہیں ملتے اس لئے!۔۔۔۔کیا مطلب!"

اور ساربان اپنی آنکھوں پر سے منڈا سا اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تم شہروں میں رہنے والے اپنے باغوں میں ننھی ننھی مصنوعی پہاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے ریت کے قطعے بنا لیتے ہو کہ وہاں پہاڑ اور ریگستان نہیں ہیں۔ ہم ریگستانوں والے اپنے گاؤں کو پھولوں کے نام اس لئے دیتے ہیں کہ یہاں پھول نہیں ملتے۔ بات ایک ہی ہے۔ جو چیز حاصل نہ ہو سکے اس کا نام لینے سے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ ہم سمن سے آ رہے ہیں۔ ہم سوسن جا رہے ہیں۔ کیا تمہیں ان ناموں میں کوئی کیف' کوئی رس محسوس نہیں ہوتا!"

اور میں ہنستے ہوئے بولا۔ "کتوں کے باورچی کو پھولوں سے کیا لگاؤ! ۔۔۔۔الو کیا جانے کہ دن کی روشنی کیا چیز ہے! بھینسے کو کیا معلوم کہ....."

اور بوڑھا میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "آپ کو تو مذاق اڑانے میں بہت مزا ملتا ہے۔ ابھی تو مجھے آپ نے الو اور بھینسا بنایا ہے۔ اب اگر میں آپ کو نہ ٹوکتا تو خدا جانے آپ میرے لئے کیا کیا نام تجویز کرتے!"

"گھن چکر۔" میں بولا۔ ساربان اور میں زور زور سے قہقہے لگانے لگے اور جب ہمارے قہقہے ختم ہوئے تو میں نے کجاوے پر دبی دبی ہنسی سنی۔ پلٹ کر میں نے اوپر دیکھا اور رنگے لباسوں کو بے چینی سے اور گرد لپیٹتی ہوئی لڑکیاں سمٹ سمٹ گئیں۔ میرے دماغ پر ہلکی ہلکی نسیم سی چلنے لگی جس سے میرے احساسات کی کونپلیں جھک گئیں اور دیر تک میرے خوابوں کے پھول

اپنی پنکھڑیاں پھڑپھڑاتے رہے' اور جب مجھے سکون سا محسوس ہوا تو ساربان اور میرا ملازم بھوت پریت کی باتیں کرنے لگے۔ "بھوت تو خیر بھوت ہوئے۔"

...... میرا ملازم کہہ رہا تھا۔ "لیکن یہ پریت کا کیا مطلب!"

ساربان بولا۔ "پریوں کو کہتے ہیں نا۔"

"اور پریاں کیا چیز ہوتی ہیں؟" میرے ملازم نے پوچھا۔

"پریاں؟"

"ہاں۔ پریاں۔ اور یہ خیمہ تو اوپر کسی کجاوے میں ٹکا دو۔"

ساربان نے ہنستے ہوئے خیمہ اس کے کندھوں سے اتارا اور اسے اوپر کجاوے کی طرف اٹھاتے ہوئے بولا۔ "لے نرگس تو اپنے آگے رکھ لے یا اُدھر نسترن کو دے دے!"

میرا ملازم ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ہاں تو کیا ہوتی ہیں پریاں؟"

"پریاں؟" ساربان سوچنے لگا۔۔۔۔"پریاں خوب صورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کے سنہرے پر ہوتے ہیں۔ وہ ہواؤں میں تیرتی رہتی ہیں اور جب ان کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔"

اور میں لاشعوری طور پر کجاوے کے سائے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔۔۔۔خوبصورت لڑکیاں۔۔۔۔سنہرے بالوں والی۔۔۔۔جادو بھرے سایوں والی۔۔۔۔اور اچانک یہ خیال میرے دل میں چبھنے لگا کہ کہیں میں بھوت پریت کے بس میں تو نہیں آ گیا!۔۔۔۔یہ زرد سنسناتی ہوئی چاندنی۔۔۔۔یہ گھنٹیوں کی خوابناک ٹنٹناہٹیں۔۔۔۔یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اونٹ ۔۔۔۔یہ ہواؤں میں تیرتی ہوئی پریاں۔۔۔۔یہ سمن سے آنے والا اور سوسن کو جانے والا قافلہ۔۔۔۔یہ عجیب دنیا ہے! میں گھبرا سا گیا۔ لیکن اچانک میرے ہم سفر ساربان نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور یہ گیت گا کر مجھے پھر انہی رنگیلے

میدانوں میں لے آیا:

اے کھجور کی ڈالی پر پھدکتی ہوئی مولن۔ اڑ جا اور اپنے مولے کا کسی اور کھجور پر انتظار کر کہ اس کھجور کے تلے آج میری محبوبہ آئے گی!

اے کھجور کی ڈالیو! ہولے ہولے جھولو اور اپنے سوکھے ہوئے پتوں کو کھڑکھڑاؤ نہیں کہ آج یہاں میری محبوبہ آئے گی؟

اے تیز و تند ہواؤ' ان شاخوں سے لپٹ لپٹ کر سرسراؤ نہیں اور اس بوڑھے تنے میں گھس کر سیٹیاں نہ بجاؤ کہ آج یہاں میری محبوبہ آئے گی! اے ستارو! روشنی کی پھواریں برساؤ۔ اور اے تتریو' اپنے پروں کی ایک سیج بچھاؤ کہ آج یہاں میری محبوبہ آئے گی!

"کس کا گیت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا اپنا" وہ بولا۔

"اچھا تو تم گیت بھی بنا لیتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "جب چاندنی راتوں میں ایک تنہا نوجوان اونٹ کی نکیل تھامے وسیع میدان میں کسی دور کی منزل کو جا رہا ہو تو وہ گیت بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن بنانے والوں کو ایک اور چیز بھی تو چاہئے۔"

"کجاووں پر کنواری لڑکیاں بیٹھی ہیں!"

اور یہ موضوع یہاں ختم ہو گیا۔

"کس کی برات ہے؟" میرے ملازم نے پوچھا۔

اور ساربان نے جواب دیا۔ "سمن کے سفید پوش کے بیٹے کی۔ ہم سوسن کے ایک بہت ہی غریب گھرانے میں جا رہے ہیں۔"

"یہ کیوں؟" میرے ملازم نے پوچھا۔

ساربان میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا ——— "بھوت پریت کا اثر ہے!"

——— اور اوپر کجاووں میں نئے لباس سرسرائے۔ اور جب ہم سوسن کے قریب پہنچے تو دور ہمیں بہت سی لالٹینیں نظر آئیں۔ ادھر سے گولے چھوٹنے لگے' برات کے اگلے سرے پر ڈھول اور شہنائیاں بجنے لگیں' اونٹوں کے گھٹنوں اور گردنوں کیساتھ گھنگروں کے ہار باندھ دیئے گئے اور مختلف سریلی آوازوں سے میدان میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ ساربان نے مجھ سے پوچھا۔ "رات کہاں بسر کریں گے آپ؟"

اور میں نے جواب دیا۔ "میری یہاں کوئی جان پہچان تو ہے نہیں۔ میں تو گاؤں اس لیے آیا ہوں کہ یہاں کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں گی۔ یہیں باہر کسی کھیت کے کنارے خیمہ تان لوں گا۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "کیا ضرورت ہے خیمہ کھڑا کرنے کی۔ میرے ہاں پڑ رہیئے گا۔ ہم تو گانے ناچنے لگ جائیں گے اور پھر آپ بھی مسافر' ہم بھی مسافر۔ سب مسافر ہم وطن ہوتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا۔ شاید میں انکار کر دیتا۔ لیکن وہ شاعر تھا اور شاعروں کے متعلق میں نے جو کچھ کتابوں پڑھا ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ بہت حساس ہوتے ہیں۔

گو اس رات مجھے نیند نہ آئی لیکن مجھے ایک سادہ سا بستر مل گیا اور شہنائیوں ڈھولوں اور باجوں تاشوں کی گونج میں میں سوچتا رہا کہ مہذب دنیا سے دور رہنے والے ان ان پڑھ ساربانوں کو مسافر نوازیاں کس نے سکھا دیں! مجھے اچھے طرح یاد ہے کہ جب میں پہلی بار دہلی گیا اور وہاں چاندنی چوک میں ایک صاحب سے کشمیری دروازہ کا راستہ پوچھا تو وہ ناک بھوں چڑھا کر بولا۔ "ادھر چلے جایئے اور پھر اُدھر مڑ کر سیدھے چلے جایئے گا!" ——— اور جب میں نے اِدھر دیکھا تو ایک بلند اور وسیع عمارت کھڑی تھی۔ اُدھر ایک چھاپہ خانہ تھا اور سامنے ناک کی سیدھ میں وہی ٹریموں کی کھڑکھڑاہٹوں سے لبریز چاندنی

چوک!

—— کس کا رہنے والا یہ نوجوان کتنی محبوب شخصیت کا مالک ہے! اور کتنا اچھا گاتا ہے! اور اس کے گیتوں میں کتنا رس اور کتنی مٹھاس ہے! اور وہ کجاووں میں بیٹھی ہوئیں عورتیں جنھوں نے برات کے اچانک رک جانے' پر ذرہ بھر بھی برا نہ مانا —— اور وہ قافلہ سالار گلاب خاں جس نے ایک اجنبی کے لیے ویران صحرا میں قافلے کا قافلہ روک لیا —— اور پھر یہ کھلے میدان اور ابھرے ہوئے ٹیلوں پر چھٹکی ہوئی چاندنی —— یہ چالیس پچاس گھروں والا ننھا سا گاؤں —— یہ ڈھول اور شہنائیاں —— یہ خالص کھدر کا بستر اور یہ پرانی بھونڈی لالٹینیں —— کتنی پیاری ہے یہ دنیا اور کتنی پاک ہے اس کی فضا! سوچتے سوچتے میں اپنے بستر سے اٹھا اور دروازے پر کھڑے ہو کر سامنے نظریں دوڑائیں۔ لمبے لمبے شعلے اچھالتی اور دھواں اڑاتی ہوئی مشعلوں کے ارد گرد نوجوان دہقان گھوم رہے تھے اور پاس ہی ایک گھر سے کنواریوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ہولے ہولے قدم اٹھاتا مجمع کے قریب پہنچا۔

ٹین کی طرح بجتی ہوئی پرانی ڈھولک کے ارد گرد سب ناچ رہے تھے۔ مشعلیں ان سب کے چہروں پر آگ سی لگا رہی تھیں اور بہت پرے کچے گھروندوں کی چھتوں پر نوجوان لڑکیاں —— اور آس پاس ٹنڈ منڈ بیریوں پر شریر بچے دم بخود بیٹھے گیت سن رہے تھے اور ناچ دیکھ رہے تھے۔ چوڑے تلووں اور پھٹی ہوئی ایڑیوں کے پے بہ پے پیچ سے ڈھولک بجانے والے کے ارد گرد ایک بگولا سا منڈلا رہا تھا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے نکلی ہوئی صدائیں سنہرے غبار میں گرجتی اور ٹیلوں سے ٹکراتی کائنات سے جیسے لپٹی پڑتی تھیں۔

تھالی میں کٹورا دھرا ہے پنگھٹ کے پانی میں تیرا چہرہ کانپ رہا ہے۔

بیری پر طوطی بیٹھا ہے گھرو منڈیروں کی اوٹ میں کنواریوں کی تاک میں ہیں!

بھٹی سے دھواں اٹھ رہا ہے یہ پگڈنڈی پر کس مسافر کی گھوڑی نے غبار سا اڑا دیا!

دلہن میکے سے آ رہی ہے دولھا مہندی رچے پاؤں کے لئے گیندے کی کلیاں اکٹھی کر رہا ہے!

دھم دھا دھم دھپ دھپ! دھم دھا دھم دھپ دھپ! —— اور پاؤں کے تال اور گیت کی لے سے ہم آہنگ سننے والے نوجوانوں کی "ہائے ہائے" "واہ واہ" —— اور ڈھولک بجانے والے کی انگلیوں کا والہانہ رقص —— بیشمار خیالے پاؤں کی وحشیانہ کروٹیں —— ڈھولک کی آخری دھپ —— اور پھر قہقہے اور حقے کی گڑگڑائیں! سرگوشیاں اور نئے گیت کی تیاریاں!

مجھے دیکھ کر میرا نوجوان ساربان دوست میری طرف لپکا اور میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ "آپ سوئے نہیں ابھی تک؟ میں تو سمجھے بیٹھا تھا کہ آپ کب کے آرام کر رہے ہوں گے۔ آپ دن بھر کے تھکے ماندے ہیں۔ جا کر لیٹ رہیے۔ ہمارے ناچ گانے میں کیا دھرا ہے! سنا ہے آپ کے شہروں میں تو لڑکیاں ریشمی لباس پہن کر ناچتی ہیں۔ اور جب قسم قسم کے سازوں کی دھن پر گاتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کانسی کے ان گنت کٹورے آپس میں ٹکرا کر جھنجھنا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ لڑکیاں نہیں ہوتیں پتلیاں ہوتی ہیں۔ پیسے دو اور نچوالو۔ اپنی خوشی سے ناچنے والیاں صرف ان صحراؤں میں رہتی ہیں۔ وہاں تو ناچ اور گانا کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔"

ناچتے ہوئے قدم رک چکے تھے اور ڈھولک بجانے والا ڈھولک کی گرہیں تن رہا تھا۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے مجھے گھور رہے تھے جیسے میں

پرانے زمانے کی داستانوں کا ہیرو ہوں اور لنکا دیپ کے جنوں اور پریوں کی قید سے نکل کر آیا ہوں۔

میرے ساربان دوست نے مجھے میری اقامت گاہ تک پہنچا دیا اور کہا۔

"آپ آرام کریں۔ صبح سویرے آپ کو جگا دوں گا۔ اس وقت آپ کیا چیز پینے کے عادی ہیں؟"

"پتلی چھاچھ۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور وہ ہنستا ہوا دور ناچنے والوں کے جمگھٹ میں مل گیا۔

میں بستر پر دراز تھا اور اس عجیب و غریب ماحول کی لطافتوں اور سحر انگیزیوں کے متعلق سوچ بچار میں مصروف تھا کہ اپنے قریب مجھے چوڑیوں کا ایک چھناکا سا سنائی دیا۔ میں سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹا پڑا تھا اور اپنے خیالوں کی دنیا میں محو پرواز تھا' اس لیے اس چھناکے کو واہمہ سمجھ کر کروٹ بدل لی۔ لیکن اچانک میرے کاندھے کو کسی نے چھوا اور ساتھ ہی دھیمی سی آواز آئی۔ "سنبل ـــــ اے سنبل! تم تو کہتے تھے کہ مجھے آج رات نیند ہی نہیں آئے گی؟"

میرے خیالوں کی جنت میں صرف ایک حور کی کمی تھی جو اب پوری ہو گئی۔ لیکن پردیس میں ایک اجنبی لڑکی کو اپنے اس درجہ قریب پا کر میں گھبرا سا گیا۔ چادر منہ پر سے اتار پھینکی اور کھاٹ پر اٹھتے ہوئے بولا۔ "نیند تو مجھے بھی نہیں آتی لیکن میں سنبل نہیں' میرا نام غضنفر ہے!" ـــــ اور میرا بھاری بھرکم نام سن کر وہ بجلی کی تیزی سے پلٹی اور لپک کر مکان سے باہر نکل گئی!

"اچھا تو یہ بات ہے!" میں نے سوچا اور کالی چھت کے نیچے بھونڈی لالٹین کی زرد روشنی میں میں اپنے آپ کو الف لیلہ کا ایک نوجوان شہزادہ سمجھنے لگا جو شکار کے بہانے نازک اندام لڑکیوں سے کھیلتا پھرتا ہے۔ جسے شرمیلی کنواریاں رات کے اندھیرے میں شانہ پکڑ کر ہلاتی ہیں اور جس کے اشارے

سے قافلے ایک دم رک جاتے ہیں!

میں نے محسوس کیا کہ میری روح کے نہاں خانے میں جگنو چمکنے لگے ہیں' بالکل اس طرح جیسے دہلی میں ایک بار چمکے تھے۔ میں نے وہاں ایک نفیس بالا خانہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ مقابل کی عمارت میں ایک انکم ٹیکس افسر رہتے تھے جن کی لڑکیاں اکثر چھت پر چڑھ کر کشیدہ کاڑھا کرتی تھیں۔ اور جب کشیدہ کاڑھتے کاڑھتے تھک جاتی تھیں تو سہگل کے گائے ہوئے گیتوں اور ملکہ پکھراج کی الاپی ہوئی غزلوں اور امراضیاء کی اڑائی ہوئی تانوں کی دھیمے سریلے سروں میں نقل اتارتیں۔ میں کئی بار اپنے بالا خانے کی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں میں سے انہیں دیکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور جب ان میں سے مجھے کسی کے چمکتے ہوئے بال یا گورے شانے یا ناچتی پتلی مخروطی انگلیاں' یا گلابی پاؤں دکھائی دیتے تو میرے دل کے اندھیرے میں اچانک بہت سے جگنو ٹمٹمانے لگتے اور یہ ٹمٹماہٹ اس وقت تک قائم رہتی جب تک میں اپنے رخسار ٹکا کر ان ٹمٹماہٹوں کو زندہ کر لیتا۔ کئی بار جی میں آئی کہ ان میں سے کسی ایک کی توجہ اچانک میری طرف منعطف ہو جائے۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کے جھرمٹ سے نکل کر دیوار پر کہنیاں رکھ دے اور ہاتھوں کے پیالے میں اپنی ٹھوڑی جما کر مجھے دیکھے۔ دیکھتی جائے اور مسکراتی جائے اور جب دوسری لڑکیاں نیچے اتر جائیں تو وہ کہیں سے چھپتی چھپاتی میرے پاس آ جائے اور میرے بازوؤں پر اپنی زلفیں بکھیر کر کہے۔ "غضنفر تم میرے خوابوں کے دیوتا ہو۔ میں چھت پر کشیدہ کاڑھنے نہیں آتی۔ تمہیں دیکھنے آتی ہوں۔ غضنفر تم سبز اور نیلے اور گلابی شیشوں کے پیچھے سے مجھے نہ جھانکا کرو۔ اس مقصد کے لیے سفید شیشے بہت اچھے رہتے ہیں۔ یا اگر تم کھڑکی کھول ہی دیا کرو تو کیا حرج ہے۔ تہذیب نو کا اگر ہمیں یہ پہلا سبق بھی یاد نہیں تو تف ہے ہم دونوں کی جوانیوں اور تعلیموں پر!

ـــــ اور غضنفر۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں ہر رات تمہارے چرنوں میں اپنے

پریم کے پھول ارپن کر جایا کروں کیونکہ تم میری خوابوں کے دیوتا ہو!"—— یہ سرگوشیاں مجھے اپنے بالا خانے کی چار دیواری میں سرسراتی ہوئی سنائی دیتیں اور میں سوچنے لگتا کہ ان سب لڑکیوں میں سے وہ کون سی لڑکی ہے جو یوں چھپ چھپ کر میرے دل میں جگنو سے روشن کرتی رہتی ہے——اور جب جگنو چنگاریوں میں تبدیل ہونے لگے——جب مجھے ان ٹمٹماہٹوں میں ہلکی ہلکی تپش کا احساس ہونے لگا تو میں گھبرا سا گیا کیونکہ میری منگنی ہو چکی ہے اور کہتے ہیں کہ میری ہونے والی بیوی اس قدر خوبصورت ہے کہ اگر میں اسے دیکھ لوں تو شاعر بن جاؤں!

کھڑکیوں سے ڈر ڈر کر اور سہم سہم کر جھانکنے والے کے شانے سے اگر کسی پتلی آواز والی دوشیزہ کی انگلی چھو جائے تو نیند کہاں آئے۔ میری نیندیں اڑ گئیں۔ میری ماندگی دور ہو گئی اور جب پوپھٹنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا تو میں باہر نکل آیا۔ زرد چاند دور مغربی افق کے قریب اونگھ رہا تھا اور موٹے موٹے ستارے سفیئی آسمان پر ناچ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آگئی تھی اور گاؤں سے ڈھولک کی دبی دبی تھاپ کی دھن پر لڑکیوں کے تھکے گیتوں کی بھنک کبھی کبھی میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی جن میں سے میں صرف یہ الفاظ سمجھ سکا۔ "ندیاں—— جھرنے—— چاندنی راتیں—— ستارے—— محبوب —— آنکھیں——بال——ہونٹ!"

یہ کیسی دنیا ہے! میں نے سوچا۔ یہاں کے شاعروں کے ذہن میں جھرنوں ستاروں آنکھوں اور بالوں کے سوا اور کوئی موضوع نہیں! کیا یہاں کے لوگ موت کے نام سے ناواقف ہیں کہ ان کے گیتوں میں جاودانی کیفیتیں جھلکتی ہیں—— کیا یہاں اس حقیقت سے کوئی باخبر نہیں کہ جھرنے رک جائیں گے۔ ستارے بجھ جائیں گے۔ آنکھیں مند جائیں گی۔ اور بال جھڑ جائیں گے —— اور پھر اس ناچتے اور گاتے ہوئے ہجوم سے آنکھ بچا کر اس دھندلے

مکان میں کھسک آنے والی من چلی لڑکی کے دل میں کیا خیال سمایا تھا کہ وہ سنبل کی دھن میں بے چارے غضنفر کی رگوں میں چنگاریاں بھر کر دھوئیں کے مرغولے کی طرح فضا میں کھو گئی—— غضنفر جس نے دہلی میں رنگین شیشوں کی آڑ لے کر کئی ہوائی محل بنائے اور جو ان پتلی آوازوں اور لانبے بالوں اور جھکی جھکی آنکھوں والیوں کے ذرا سے مس کے لیے اتنا عرصہ ترستا رہا!

گیتوں کی آوازیں دھیمی پڑتی گئیں۔ اور میرے خیالات دہلی اور اس صحرا کی نازنینوں کے ہیولوں میں لپٹتے گئے۔ ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی تھی جس کی وجہ سے میرے جلتے ہوئے تلووں کو بہت سکون پہنچ رہا تھا۔ صبح کا ستارہ مشرقی افق پر کسی دلہن کے ماتھے کی طرح چمک رہا تھا اور آس پاس اکیلی دکیلی ببولوں میں ٹڈے ٹیں ٹیں چلائے جا رہے تھے۔ کہ اچانک مجھے اپنے قریب ہی ایک بھرائی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔ میں جھٹ ریت پر دبک گیا۔ کان لگا کر سنا تو آواز آئی۔" اسی لیے تو میں بار بار تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم آج اتنی اداس کیوں ہو! کمن سے باہر ڈراؤنی کھجوروں میں جب ہم چھپ چھپ کر باتیں کرتے تھے تو تم کتنی بشاش ہوتی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر پپڑیاں اور تمہاری آنکھوں میں نمی مجھے اُن دنوں نظر نہ آئی حالانکہ ہر گھڑی ہمیں اپنے راز کے کھل جانے کا ڈر تھا۔ لیکن اب—— یہ سومن کا صحرا اور یہ حیران چاند—— لوگ گاؤں میں ناچ اور گا رہے ہیں اور ہم ادھر ببول کی اوٹ میں ایک دوسرے کے اتنے قریب—— اس قدر قریب بیٹھے ہیں نرگس تمہارے دل میں آج کیسا کانٹا کھٹک رہا ہے۔ تم اتنی چپ چاپ کیوں ہو نرگس؟"—— اور اس کے بعد مجھے نرگس کی سسکیاں بھری آواز سنائی دی۔ "مجھے یہ سوا میدان جیسے نگل لے گا۔ میں تو گھبرا گئی ہوں سنبل—— سنبل میں سومن میں گھبرا گئی ہوں۔ مجھے آج بخار ہو رہا ہے۔" اور اس کے بعد بہت سی الجھی ہوئی اور ہراساں سرگوشیاں سرسراتی رہیں اور پھر ببول کی اوٹ سے ایک

سایہ اٹھا اور سنبل کی آواز آئی۔ "چلو چلیں ——— یا تم پہلے چلی جاؤ۔ اکیلی گھبراؤ گی یہاں۔"

"نہیں۔" نرگس نے جواب دیا۔ "پہلے تم جاؤ ۔ پوپھٹتے ہی میں گاؤں آجاؤں گی' اب اگر مجھے رستے میں کوئی مل جائے اور پوچھ بیٹھے کہ میں اس وقت کدھر گئی تھی۔ تو کیا جواب دوں گی میں؟"

اور سنبل بولا۔ "پھر پوپھٹے تک میں یہیں تمہارے پاس کیوں نہ پڑا رہوں۔"

"نہیں نہیں سنبل۔" دبی دبی اور ملتجیانہ آواز آئی۔ "تم جاؤ۔ بس ——— اب تم جاؤ ۔"

اور سنبل ہولے ہولے قدم اٹھاتا ٹیلوں کی پرلی طرف غائب ہو گیا۔

صبح کا ستارا بہت اونچا چڑھ آیا تھا اور پورب کے اندھیرے کپکپانے لگے تھے۔ دلی کی کشیدہ کاڑھتی ہوئی لڑکیوں اور یہاں کی صحرائی دوشیزاؤں کے ہیولے سمٹنے لگے اور آخر ایک پرچھائیں میں سما گئے جو میرے سامنے ببول کی اوٹ میں بیٹھی جانے کدھر دیکھ رہی تھی۔

اچانک ایک خیال میرے دل پر ایک لمبی سی خراش ڈالتا میرے دماغ میں گھومنے لگا جیسے لڑکے تالابوں کی سطح پر پتھر تھرکاتے ہیں اور وہ طویل سفید لکیریں پیدا کرتے بہت سے دائرے بناتے اور بلبلے چھوڑتے تہ کی طرف ڈوبنے لگتے ہیں!

ایک بہت لمبا سا چکر کاٹ کر میں نے اس ببول کا رخ کیا جہاں نرگس پوپھٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سیٹی بجاتا ہوا میں اس کے قریب سے گزرا۔ وہ ببول کے نیچے گٹھڑی کی طرح سمٹی جا رہی تھی۔ میں یونہی بے پروایانہ انداز میں ببول کے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ "شی۔ شی" میں نے تالی بجائی اور پھر دو قدم آگے بڑھ کر میں نے نرگس کے جسم کو چھو لیا۔

"شی!" میں نے پھر تالی بجائی اور اب نرگس دیوانوں کی طرح بال جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سینہ تیز تیز سانسیں لینے کی وجہ سے ابھرا اور ڈوبا جا رہا تھا' اور اس کی لٹیں اڑ اڑ کر ببول کی سوکھی شاخوں سے لپٹی جا رہی تھیں۔

"کون ہے تو؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"ارے! ——— غضنفر!" دبی دبی آواز آئی۔

"تم نے مجھے کیسے پہچانا؟"

"تمہارے شکاری لباس سے۔"

"تم کون ہو؟"

"میں ——— میں ——— میں ادھر کمن سے برات کے ساتھ آئی ہوں۔ وہاں گاتے ناچتے تھک گئی تو جی بہلانے ادھر چلی آئی۔"

"ہاہاہا!" میں ہنسا! "میں سمجھا کوئی ہرنی دبکی بیٹھی ہے۔ شکاری جہاں جائے شکار کا بھوت اس کے سر پر سوار ہوتا ہے۔ شکر ہے میرے پاس اس وقت بندوق نہ تھی ورنہ بڑی مشکل بنتی۔"

وہ خاموش کھڑی رہی۔ اس سے باتیں کرنے کے لیے کئی بہانے تیز جھونکوں کی طرح میرے ذہن پر بہت سی لہریں پیدا کرتے گزر گئے۔ مشرقی افق پر اندھیرے اسی طرح کپکپا رہے تھے اور صبح کا ستارا جیسے میرے جذبات کے بے ہنگم طوفان پر دل ہی دل میں گنگنا رہا تھا۔ آخر میں بولا۔ "کہو تو تمہیں گاؤں پہنچا دوں۔"

اس نے اڑتی ہوئی لٹوں کو ایک ہاتھ سے اکٹھا کر کے دوپٹے کے پیچھے سرکاتے ہوئے کہا۔ "میں خود چلی جاؤں گی۔ میں رستہ جانتی ہوں۔"

"رستہ تو تم ضرور جانتی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے سنبل کی فکر ہے۔ تمہاری راہ دیکھ رہا ہو گا۔"

وہ یوں چونک پڑی جیسے ننھے بچے سوتے میں بادل کی گرج سے ڈر کر

گھبرا جاتے ہیں اور حواس باختہ ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ اس نے چار طرف نظریں دوڑائیں اور پھر مجھے چند لمحے دیوانوں کی طرح گھور کر گردن جھکالی اور مٹھیوں میں ریت بھرنے لگی۔

"میں سب کچھ دیکھ رہا تھا" ——— میں نے اس کے کلیجے میں ایک اور سوئی گھونپ دی۔ مجھے کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں بڑی لذت ملتی ہے۔ میں بولا۔" میں سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن نرگس۔ تم آج اتنی اداس کیوں تھیں۔ سنبل بیچارے کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ جانے اس ریت میں اس بیچارے کے کتنے آنسو جذب ہو چکے ہیں۔ نرگس۔ گو میرا کوئی حق نہیں کہ تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دوں اور مجھے امید بھی نہیں کہ جو بات تم سنبل کو نہ بتا سکیں وہ میرے سامنے کہہ ڈالو گی' لیکن اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو میں بخوشی یہاں چند روز ٹھہر جاؤں گا۔ دیکھو نا' سنبل میرا دوست ہے۔ اگرچہ میری اور اس کی دوستی صرف چند گھنٹے قبل شروع ہوئی ہے لیکن میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تمہیں اس کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہو تو مجھے بتا دو۔ میں اسے سیدھی راہ پر لے آؤں گا۔ میں شکاری ہوں اور میرا نشانہ بہت کم چوکتا ہے۔ سنتی ہو؟"

"جی سن رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "سنبل سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ سنبل میرا بہت پرانا ساتھی ہے۔ سنبل کے من میں میرے متعلق کبھی میل نہیں آیا۔ سنبل گیت بناتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ گیت بنانے والوں کو لڑکیاں بہت چاہتی ہیں۔ لیکن وہ ان سب کے حسن سے یوں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ جیسے وہ سوائے میرے دنیا کی سب کنواریوں کے لیے اندھا ہو چکا ہے۔ لیکن میں ——— میں نے ——— مجھے ———" وہ رک گئی اور مٹھیوں میں بھری ہوئی ریت نیچے گرانے لگی۔

"تم نے بات ختم نہیں کی۔" میں اس کے قریب ہو کر بولا۔

"میں۔" وہ ہکلانے لگی۔ "میں آج بہت اداس ہوں۔ میں برات کے ساتھ نہ ہی آتی تو اچھا تھا۔"

میں نے پوچھا۔" لیکن آخر تمہاری یہ اداسی سنبل کے ساتھ بے پروائی سے کیا تعلق رکھتی ہے!"

اور اچانک ہوا میں اس کا دوپٹہ پھڑپھڑایا اور میرے بازو سے لپٹ گیا اس نے دوپٹہ کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ادھر میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی اور ہم دونوں کے ہاتھ ایکدوسرے سے چھو گئے۔ میرے بازو سے اس کا دوپٹہ لپٹا رہ گیا اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے بال ہوا میں اڑنے لگے اور میں نے اس کا دوپٹہ بازو سے اتارتے ہوئے کہا۔ "لو" ——— اور ہمارے ہاتھ پھر چھو گئے۔ لیکن اب کے جو چھوئے تو الگ نہ ہو سکے' جیسے چمٹ کر رہ گئے ہیں ——— ہم دونوں کی انگلیوں میں کوئی مبہم سی لرزش بھر گئی۔ اور میں نے وہاں ببول کی سوکھی ٹہنیوں کی آڑ میں دیکھا کہ افقِ مشرق پر پو پھوٹ رہی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں کی چمک' اس کے گلابی گالوں کی غیر محسوس نمی اور اس کے باریک ہونٹوں کی کپکپاہٹ پر نظریں گاڑ دیں اور جب ہماری اکڑی ہوئی انگلیاں ڈھیلی ہوئیں اور ہمارے سر پر سے ایک پرندہ سن سے گزر گیا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن تم اداس کیوں ہو نرگس؟"

اور وہ میری گھڑی کے شیشے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔" آج رات جب سے میں نے آپ کی باتیں سنی ہیں اور پھر آپ کو سنبل کے دھوکے میں جگا بیٹھی ہوں میرے دل میں آپ کا چہرہ بس رہا ہے۔ مجھے ان صحراؤں سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے آپ سے اور آپ کے وطن سے محبت ہے۔ لیکن آپ پردیسی ہیں۔ آپ آجکل یہاں سے چلے جائیں گے اور میں راتوں کو سن کی کھجوروں کے جھنڈوں میں بیٹھ کر آپ کی پرچھائیوں سے باتیں کیا کروں گی ——— آپ کب جائیں گے؟"

"میں کبھی نہیں جاؤں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ آٹھ دس کوؤں کا غول ہمارے سر پر سے کائیں کائیں کرتا سومن کی طرف اڑ گیا۔

اور جب وہ ببول کی آڑ سے نکل کر سومن کو چل دی تو میں نے یوں محسوس کیا جیسے اچانک مجھ پر مسرتوں کے بادل برس پڑے ہیں۔ جیسے خفتہ مقدر کی گردن کٹ کر دور جاگری ہے اور جیسے دنیا جہان کی لڑکیاں اور خاص کر دہلی کے اس بالا خانے کی دوشیزائیں لپک لپک کر میرے قدموں پر سر رکھ دیتی ہیں اور کہتی ہیں "ہمیں چاہو" —— اور میں سب کو ٹھکراتے ہوئے کہتا ہوں۔ "نرگس کے پھولوں اور تھوہر کے کانٹوں کا کیا مقابلہ۔ جاؤ۔ یہ شکاری انہیں صحراؤں میں شکار کھیلے گا —— جاؤ"! اور ان لڑکیوں کو ٹھکرانے کی دھن میں میں نے کئی بار چلتے چلتے ریت کا ایک طوفان اڑا اڑا دیا!

میں واپس سومن پہنچا اور جب برات کے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو اواس سنبل نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئی کہا۔ "اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

میں مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں تمہارے ساتھ سمن میں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم جیسا سادہ مزاج اور پیارا دوست کہیں نہیں ملا اور تمہارے ہمراہ چند لمحے گزار کر مجھے روحانی خوشی ہوگی۔"

سنبل خوش ہو کر بولا۔ "آپ میری آنکھوں میں رہئے۔ میرا گھر آپ کا گھر ہے۔ آپ شوق سے تشریف لایئے۔"

اور میرا بوڑھا ملازم تڑپ کر کہنے لگا۔ "لیکن میاں جی۔ وہ میری بڑھیا بیچاری کھاٹ پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی ہو گی۔ میرے بغیر اسے پوچھنے والا ہی کوئی نہیں۔ پھر اس صحرا میں ہرنیاں تو اب کے ملتی نہیں کہ وقت گزر سکے۔"

اور بوڑھا بھویں جھکا کر اور پتلیاں پھیر کر مجھے یوں گھورنے لگا جیسے

کہہ رہا ہے۔ "بچے تجھ پر بھوت پریت کا اثر ہو گیا ہے۔ تجھ پر اب میرا بس نہیں چل سکتا۔ خدا ہی تجھے واپس لائے تو لائے!"

اور جب برات واپس سمن کو روانہ ہوئی تو سب نوجوان ساربانوں نے میری طرف اشارے کرتے ہوئے سنبل سے آکر پوچھا۔ "کیا آپ بھی سمن جا رہے ہیں؟" —— "ہاں"۔ وہ فخریہ انداز میں جواب دیتا اور سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور کہتے۔ "بڑی خوشی کی بات ہے!" —— اور میں نے اوپر سنبل کے اونٹ پر جھولتے ہوئے کجاوے میں نرگس کو دیکھا جس کا چہرہ تیز دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا اور جس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی جو شاید صبح کے ستارے کی کپکپاہٹوں سے مل رہی تھی!

اس روز مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بے چارے جھوٹ نہیں لکھا کرتے۔ بالکل سچ کہتے ہیں۔ ان کے خیالات میں غلو کا نقص نکالنے والے ذرا کسی ایسے کجاوے کے سائے میں چل کر دیکھیں جس پر ایک پیکر شباب بیٹھی جھول رہی ہو، تو انہیں اپنے اعتقادات کی قدر عافیت معلوم ہو جائے میں چاہتا تھا کہ اس کجاوے کے ساتھ مرتے دم تک سفر کرتا رہوں اور چھریوں ہو کہ اونٹ اپنے قافلے سے الگ ہو کر بھٹک جائے۔ بیشمار ٹیلوں کے سنسناتے ہوئے بیکراں میدان میں یہ کجاوے والی نیچے اترے اور وہاں ہم چاندنی راتوں اور سہمیں صبحوں کے آغوش میں ایسی میٹھی باتیں کریں جو شاعر لوگ اپنے شعروں میں لکھا کرتے ہیں، اور پھر اچانک مجھے سنبل کا خیال آگیا۔ اس اونٹ کے بھٹک جانے سے سنبل بیچارے پر کیا گذر جائے گی! سر پھوڑ لے گا کسی دیوار سے! دیوانہ ہو جائے گا اور تپتی دوپہروں میں دہکتی ریت پر ننگے پاؤں محو تلاش رہے گا اور کسی اداس شام کو، جب —— لیکن اچانک مجھے سنبل کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ گا رہا تھا۔

تمہارا چہرہ دن کے چاند کے طرح بے رنگ اور بے

رونق کیوں ہے؟
تمہارے بالوں پر یہ گرد اور تمہاری پلکوں پر یہ نمی
کیسی ہے!
تمہاری باتوں میں یہ نا امیدیاں کیسی ہیں؟ تم یہ کیوں نہیں
کہہ دیتیں کہ تم نے
کہیں میری موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہے؟

اونٹوں کی گھنٹیاں ٹناٹن بجی جا رہی تھیں اور ان کے قدم ریت پر ہلکی سی خش خش کی آواز پیدا کرتے ٹیلوں کے درمیان ناچتے ہوئے بڑھے جا رہے تھے۔ کجاوے پر ایک بار میں نے نرگس کی طرف دیکھا جو سنبل پر نظریں گاڑے کچھ سوچ رہی تھی اور جونہی اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں تو وہ مسکرا دی اور میں سمجھا جیسے یہ اونٹ اپنے قافلے سے بھٹک گیا ہے!

کمن بہت پیارا گاؤں تھا۔ پچاس ساٹھ گھروندے اور پھر سارے گاؤں کو محیط کئے ہوئے لمبی لمبی کھجوروں کی فصیل!—— ان کھجوروں کے آس پاس کھیت تھے اور کھیتوں کی پرلی طرف وہی ریت کا سمندر!—— سنبل مجھے اپنے گھر لے گیا۔ رنگین پایوں والے ایک پلنگ پر کھدر کی نئی چادر بچھائی گئی اور اسے ایک چھپر کے نیچے دھر دیا گیا۔ پھر سنبل اور اس کے گھر والے میرے پاس آکر بیٹھے تو ایسی خلوص بھری باتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے کہ میرے جی میں آئی میں یہاں سے کھسک کر نرگس کے پاس چلا جاؤں اور اسے کہوں۔ "نرگس۔ میں نے غلطی کی کہ تمہارے سامنے یہاں سے بھی نہ جانے کا وعدہ کر بیٹھا تم دراصل سنبل کی ہو جو اتنا سادہ اور اتنا مخلص ہے اور میں غاصب نہیں بننا چاہتا۔ میں پڑھا لکھا نوجوان ہوں اور جانتا ہوں کہ کسی کے دل میں بے وجہ سوئی چبھونے سے یہی بہتر ہے کہ اپنے دل پر نشتر چلا لیا جائے۔"

لیکن اس روز شام ہونے سے چند لمحے پیشتر میں سنبل کے گھر سے نکلا!

کہ ذرا کھیتوں میں ٹہل آؤں تو دور کھجوروں کی فصیل کی اوٹ میں مجھے نرگس دکھائی دی۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو وہ بولی۔ "میں کب کی یہاں بیٹھی آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کسی وقت وہاں سے نکلیں گے۔ یہ میرا گھر ہے اور آج رات وہ سامنے بڑے بڑے ٹیلوں میں گھری ہوئی کھجوروں تلے ملیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

اور جب میں نرگس سے رات کو آنے کا وعدہ کر کے اسی بڑے بڑے ٹیلوں میں گھرے ہوئے کھجوروں کے جھنڈ تلے پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں ہر طرف ننھے ننھے فرشتے پر پھڑپھڑاتے باریک گلوں سے تیز تیز سر نکالتے چکر لگا رہے ہیں۔ خادمائیں عود و عنبر کی خوشبوئیں چھڑک رہی ہیں۔ پھولوں کی سیج بچھی ہے اور بنسریوں اور الغوزوں کی لمبی لمبی تھرتھراتی تانوں میں لپٹا ہوا یہ سیج اپنا آغوش وا کئے مجھے اور نرگس کو کھینچ رہا ہے۔

شام کو نہایت پر تکلف کھانا کھا کر میں سنبل اور اس کے بزرگوں کو شہروں کی باتیں سناتا رہا۔ ریڈیو، ٹریموں، بجلی کی روشنیوں اور آپی آپ اوپر اٹھ جانے والے مکانوں کی باتیں سن کر وہ میرے نزدیک کھسکتے آئے۔ ایک میراثی میری پیٹھ دابنے پر مامور ہو گیا۔ حقے کی نے ادھر ادھر تیزی سے پھرتی ہوئی بار بار میرے لبوں کو چھونے لگی اور بہت دیر تک وہیں رکی رہتی۔ اور سنبل پل پل بھر بعد مجھ سے پوچھ لیتا۔ "آپ کو نیند تو نہیں آئی؟ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ آپ گھبرا تو نہیں گئے؟"—— اور یہ کہہ کر وہ چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھ جاتا اور جب کہیں ادھر ادھر دیکھتا تو سامنے دیوار پر ایک کیل سے لٹکی ہوئی لالٹین کی زرد شعاعوں میں مجھے اس کی پلکیں اور رخساروں پر ایک مبہم سی چمک نظر آ جاتی!

جب سب اپنی اپنی کھاٹوں پر جانے کے لئے اٹھنے لگے تو میں نے سنبل سے کہا۔ "میں ذرا باہر کھیتوں میں گھوم گھام آؤں۔ میں دراصل سیر سپاٹے کا

بہت عادی ہوں اور دن بھر کے سفر سے بھی میرا جی سیر نہیں ہوا۔"

اور سنبل نے پوچھا۔ "کیا میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟"

اور میں گھبرا کر بولا۔ "نہیں نہیں۔ تم نے کونسا گناہ کیا ہے کہ مجھ دیوانے کے ساتھ ٹانگیں تھکاتے پھرو۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔"

اور جب میں نے کھیتوں کی مینڈھوں پر سے گزر کر کھجوروں کے اس فردوسی جھنڈ کا رخ کیا تو کوئی پرندہ سن سے میرے سر پر سے گزرا اور کھجوروں کے جھنڈ کے ساتھ ٹکرا کر پھڑپھڑاتا اندھیرے میں ڈوب گیا!

کھجوروں کے منقش تنوں کے درمیان نرگس میرے انتظار میں تھی۔ بہت دیر تک بیٹھے ہم عجیب و غریب باتیں کرتے رہے۔ میں اسے کہتا۔ "نرگس یہ تمہارے بال نہیں یہ تو میری تقدیر کا تانا بانا ہے۔" اور وہ کہتی۔ "غضنفر (اور یہ نام کہتے ہوئے اس کی زبان کئی بار لڑکھڑائی) یہ تمہاری آنکھیں نہیں، یہ تو مستیوں کے دو چشمے ہیں، جنہوں نے مجھے اس قدر چھکا دیا ہے۔" میں کہتا۔ "نرگس یہ تمہارے پاؤں ہیں یا کنول کے پھول جن پر شفق کا عکس پڑ رہا ہو۔" اور وہ کہتی۔ "غضنفر۔ یہ تمہارے ہاتھ گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں یا کمخواب کے۔!" —— اور اس کے بعد جب میں نے اسے شہروں کی باتیں سنائیں تو وہ میرے بہت قریب کھسک آئی۔ اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔ اور بہت دیر تک ریڈیو، ٹریموں، بجلی کی روشنیوں اور آپی آپ اٹھ جانے والے لفٹوں کے حالات سن کر دم بخود رہ گئی —— پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور جب میں سنبل کے مکان کے قریب ایک موڑ مڑا تو اچانک سنبل میرے مقابل آ گیا۔ "بہت دیر لگا دی آپ نے" اس نے کہا۔

"ہاں بہت دیر ہو گئی۔" میں نے رکتے رکتے جواب دیا۔ "دراصل مجھے ریت پر بہت رات گئے تک بیٹھے رہنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ شہروں میں اس قسم کی ریت اور خاموش راتیں اور کھلے میدان نہیں ہوتے نا —— لیکن

تم کہاں پھرتے رہے؟"

اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی ادھر کھجوروں کے اس جھنڈ کے پاس پھرتا رہا۔"

"کس جھنڈ کے پاس؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اور وہ مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر۔ اُس جھنڈ کے پاس"! اور میں نے جی ہی جی میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمارا جھنڈ مغرب کی طرف تھا۔

جب تین راتیں کھجوروں کے اس فردوسی جھنڈ کے نیچے دفن ہو چکیں اور چوتھی رات کا آغاز تھا —— اور جب میں نرگس کے زانوؤں پر سر رکھے اسے اختر شیرانی کی ایک نظم کا مطلب ذہن نشین کرا رہا تھا تو اچانک ایک قد آور سایہ ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں بھڑک کر اٹھے اور ہمارے سر ٹکرا گئے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا "کون ہے تو؟"

"میں سنبل ہوں"۔ وہ بولا۔ "اور یہ نرگس اور آپ غضنفر علی خاں ہیں۔"

اور وہ قریب آ کر ایک ہاتھ میرے کاندھے پر اور دوسرا نرگس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو کوسنے نہیں آیا۔ میں آپ سے صرف ایک بات کرنے آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں نرگس نے مجھے شاعر بنایا۔ نرگس نے میری اجاڑ راتیں بسائیں۔ نرگس نے میری زندگی پر خوابوں کی پھواریں برسائیں۔ آپ سب جانتے ہیں کیونکہ آج چوتھی رات ہے، میں تنوں کی اوٹ میں آپ دونوں کی باتیں سنتا رہا ہوں۔ آپ میرے دوست ہیں اور گو یہ آپ کا حق نہ تھا کہ میری محبوبہ ہتھیا لیتے لیکن اب —— جب کہ نرگس سنبل سے تھک چکی ہے، میں اپنی یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ میں غیور دہقان ہوں۔ میں چاہتا تو آپ کے

کلیجے سے ایک چھرا پار کر کے آپ کو انہیں ٹیلوں پر پھینک دیتا اور وحشی گدھیں آپ کی بوٹیاں نوچ نوچ کر آپ کے شہر پر جاکر منڈلاتیں۔ لیکن میں شاعر ہوں۔ میں گیت بناتا ہوں اور میں صرف اپنی محبت کی تشنگی بجھانے کا قائل نہیں۔ مجھے ہر دل کی دھڑکن کی قدر ہے۔ نرگس سے آپ کو محبت ہو گئی ہے تو اس میں آپ کا قصور نہیں۔ میں اگر آپ کی محبت میں دخل دوں تو یہ میرا پاگل پن ہو گا۔ کیونکہ نرگس کے دل میں اب میری کوئی جگہ نہیں رہی۔ لیکن اتنا یاد رکھئے کہ آپ پردیسی ہیں۔ مسافر ہیں آپ۔ نرگس کا دل نہ توڑیئے گا۔ اگر نرگس کا دل آپ کے ہاتھوں ٹوٹا تو یاد رکھیئے کہ——لیکن چھوڑیئے اس قصے کو۔ میں صرف اپنی نرگس کو آپ کے حوالے کرنے آیا تھا۔ میں اپنے دوست اور اپنے مہمان پر ہاتھ اٹھانا گناہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے نرگس بیٹھ جاؤ یہاں۔ اور غضنفر علی خاں کا سر اپنے زانو پر رکھ لو' اور غضنفر علی خاں صاحب۔ آپ اسے کسی شاعر کی نظم کا مطلب سمجھا رہے تھے' سمجھائیے۔ اور اب مجھے اجازت دیجئے اور میری اس مداخلت کو برا نہ مانیے کہ جب جلتی ہوئی لکڑیوں پر پانی ڈالا جائے تو ان میں سے جو دھواں اٹھتا ہے' وہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔——اچھا خدا حافظ۔"

ہم دونوں دم بخود کھڑے تھے اور سنبل ہولے ہولے چلتا کھجوروں کی فصیل میں غائب ہو گیا تھا۔ کتنی دیر تک ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ اور جب نرگس کی سسکیاں بلند ہو گئیں اور میرے دل کی دھڑکن سے کھجور کے تنے بھی لرزتے ہوئے معلوم ہوئے تو میں دھم سے ریت پر بیٹھ گیا۔ نرگس بھی بے جان لوتھڑے کی طرح گر پڑی——وہ روتی رہی——میں سوچتا رہا——اور جب اس نے روتے روتے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا تو میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ سنبل انسان ہے یا فرشتہ!——اور نرگس ہم جاگ رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں؟"——اور وہ اپنے آنسو

پونچھتے ہوئے بولی۔ "ہم جاگ رہے ہیں اور یہ سنبل ہی تھا جس نے اپنے محبت کی نعش کو اپنے ہاتھوں کفنایا——لیکن میں کیا کروں غضنفر۔ میں مجبور ہوں۔ تم اتنے اچھے' اتنے پیارے ہو——اور مجھے تم سے اور تمہارے شہر سے اتنی محبت ہے!——"

چکا چوند

جلد ہی وہ بادل چھٹ گئے جو سنبل کا سایہ ہم پر پھیلا گیا تھا اور جب میں نرگس سے جدا ہو کر سنبل کے مکان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا کہ میں کیا منہ دکھاؤں گا اپنے میزبان کو! جی میں آئی چل دوں یہاں سے' لوٹ جاؤں اپنے شہر کو۔ لیکن ایک ابابیل کھجوروں کے اسی فردوسی جھنڈ سے اڑتی ہوئی آئی اور سن سے میرے سر پر سے گزر گئی——سن سے واپس چلے جانا میرے لیے بہت دشوار تھا——اور جب سنبل نے اتنی بڑی قربانی کی تو اب اس سے جھجک کیسی——جب اس کا من اتنا صاف ہے تو اپنے من پر یہ میل کیسا! ——اور جب میں اس کے مکان کے دالان میں داخل ہوا تو وہ کھاٹ پر سے اٹھ بیٹھا اور بولا۔ "آپ آگئے ہیں؟——آپ نے میری باتیں محسوس تو نہیں کیں؟ آپ میرے بھائی ہیں اور یقین جانیئے میں آپ پر خفا نہیں——میں جس امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا وہ آپ کے حوالے کر دی' اور اب آپ کے ہاتھ میں میری امانت کی لاج ہے۔"

میں خاموش بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک حیران ہوتا رہا کہ یہ عجیب و غریب دنیا ہے' یہاں ایک دوسرے کی محبت کی اس درجہ قدر کی جاتی ہے اور یہ عجیب نوجوان ہے جس نے اپنے جذبات کا تنور اپنے سینے میں چھپا لیا ہے——پھنک رہا ہے۔ لیکن دم نہیں مارتا!

اور اب یہ سلسلہ شروع ہوا کہ جب رات کو سب لوگ سو جاتے تو وہ

کہتا "بھائی صاحب —— آپ ابھی تک باہر نہیں گئے؟" میں شرمندہ اور حیران باہر چلا آتا اور جب لوٹتا تو وہ کھاٹ پر سے اٹھتے ہوئے کہتا۔ "آ گئے آپ؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

ایک مہینہ گزر گیا۔ ہر رات نرگس کی زلفیں میرے بازوؤں پر پریشان ہو جاتیں۔ اس کے نرم زانوؤں پر سر رکھ کر میں دیر تک کھجوروں کی شاخوں میں الجھے ہوئے ستاروں کو دیکھتا رہتا۔ اب ہم باتیں بہت کم کرتے تھے کیوں کہ ہم وہ سب حسین خیالات ایک دوسرے کے سامنے اگل چکے تھے جو عشق و محبت کے عام قصوں میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اب ایک شب ایسی بھی آئی کہ جب میں کھجوروں کے اس جھنڈ کے قریب پہنچا تو مجھے اس کے ارد گرد پھڑپھڑاتے ہوئے چیتھڑوں والے خوفناک بھتنے وحشیانہ ناچ میں مصروف نظر آئے اور کھجوروں کی شاخیں مردوں کے پنجروں کی طرح فضا میں ہولے ہولے جھولتی دکھائی دیں۔ میرے قدموں میں وہ تیزی نہ تھی۔ میری رگوں میں وہ کھولاؤ نہ تھا۔ میں رینگتا ہوا جھنڈ کے پاس پہنچا۔ نرگس میری منتظر بیٹھی تھی۔ بولی۔ "تم نے آج اتنی دیر کیوں لگا دی؟ تکتے تکتے میرے آنکھیں پتھرا گئیں۔ تم آج تھکے تھکے کیوں ہو اور تمہارے چہرے پر یہ اداسی کیوں ہے؟ غضنفر تم آج کیا سوچ رہے ہو؟"

حقیقت یہ ہے کہ اب میں نرگس سے تھک چکا تھا۔ فطرتِ انسانی سکون کی شیدائی ہوتے ہوئے بھی ایک خاص وقت میں سکون سے فرار بھی چاہتی ہے۔ مجھے اب اس کے نرم زانوؤں میں فولاد کی سی سختی محسوس ہونے لگی اور جب اس کے بال میری باہوں پر لہراتے تو میرے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ جاتی جیسی چیونٹیاں رینگ رہی ہیں! یہ عجیب زندگی ہے۔ میں اس روز سوچتا رہا کہ دن بھر اجنبی دہقانوں کے جمگھٹ میں بیٹھ کر فضول گپیں ہانکو اور رات ایک اجنبی لڑکی کی خاطر اس ہولناک صحرا میں، ان ڈراؤنی کھجوروں کے

جھنڈ میں گزار دو۔ نہ سنیما، نہ ریڈیو، نہ چاندنی چوک اور نہ کناٹ سرکس، نہ ہمایوں کا مقبرہ اور نہ جامع مسجد کی سیڑھیاں! یہ ایک جیسے ٹیلے —— تیز دھوپ اور پھر رات کو ایک ہی لڑکی —— روزانہ وہی بال، وہی باہیں، وہی آنکھیں —— اور ان سب پر مستزاد یہ کہ وہی باتیں، نچوڑی ہوئی ہڈیاں۔ ہر وقت جان کا خوف اور پھر ایک اداس اور تھکی ہوئی بھیگی آنکھوں والا چپ چاپ میزبان جو نہ پہلے کی طرح گاتا ہے اور نہ قہقہے لگا کر ہنستا ہے —— اور یہ دیہاتی چھوکری —— یہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ میرے وطن سے، میری تہذیب کے اس گہوارے سے محبت کرتی ہے جہاں اس کے زعم میں غضنفر بغیر کسی خوف کے بازار کے عین درمیان کھڑا ہو کر اس کے لب چوم سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتی ہے —— "تم مجھے اپنے وطن لے جاؤ گے نا؟ تم مجھے ٹریموں پر سوار کراؤ گے۔ تم مجھے ریڈیو سناؤ گے۔ سنیما دکھاؤ گے۔ نئے نئے کپڑے خرید دو گے۔ میرے کانوں میں سونے کے بندے ہوں گے اور باہوں میں ہاتھی دانت کا چوڑا —— ہے نا؟"

مجھے ابکائیاں آنے لگیں۔ میں انگڑائیاں لینے لگا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ میں تھک چکا تھا مجھے اپنے ارد گرد ٹھہرے ہوئے پانی کی بو سی آنے لگی۔ اس روز جب نرگس نے میری اداسی کی وجہ پوچھی تو میں بولا۔ "دراصل نرگس مجھے شکار کا بہت شوق ہے۔ ایک مہینے سے میں نے کوئی نیا شکار نہیں کیا۔ کہو تو کل شکار پر چلا جاؤں! دو چار دنوں کے بعد لوٹ آؤں گا اور پھر تمہیں اپنے دیس لے جاؤں گا۔ جہاں ہر کام بجلی کے زور سے ہوتا ہے۔ عمارتوں پر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت نہیں۔ بٹن دباؤ اور کھٹ سے اوپر —— دور جانے کے لیے پیدل چلنے کی ضرورت نہیں۔ موٹر میں بیٹھو اور چھپاک سے وہ جا رہے ہیں —— نئے کپڑے خرید کر درزی کی دکان کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں، سلے سلائے جمپر اور ساڑھیاں خریدو اور پل میں دلہن

بن جاؤ——— چلو گی نا؟"

لیکن وہ تو موم کی مورت بن کر بیٹھی تھی۔ میں نے شانہ ہلایا تو رونے لگی۔ میں نے جھلا کر کہا۔ "عجیب بات ہے! میں اب ساری عمر اس جھنڈ تلے کیسے پڑا سڑتا رہوں۔ محبت کے علاوہ انسان کو دوسرے کام بھی ہوتے ہیں۔ میرے ماں باپ ہیں۔ بہن بھائی ہیں۔ میرے قیمتی شکاری کتے ہیں۔ ان کی فکر کرنا بھی مجھ پر فرض ہے۔ شکار بھی کھیلنا ہے اور پھر لوٹ آؤں گا——— یہاں سے کبھی نہ جانے کا جو میں نے وعدہ کیا تھا اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ بس یہیں جم کر بیٹھ رہوں گا——— اری یہی آٹھ دس دن لگیں گے پھر یہی جھنڈ ہو گا اور یہی غضنفر ہو گا اور———" لیکن وہ بدستور روتی رہی۔ اس کے چند آنسو میرے ہاتھ پر آگرے——— اور میری ہتھیلی پر جیسے کسی نے تیزاب چھڑک دیا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھا۔ "اچھا تو نرگس، آج اتوار ہے نا؟ اگلی اتوار کو اسی وقت یہیں موجود رہنا۔ میں ضرور آؤں گا۔ سنتی ہو؟——— اچھا"——— میں اس کے ہاتھ کو تھپکا کر جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی اور جب بہت دیر کے بعد اٹھی تو نہایت تیزی اور وحشت سے!——— قدم یوں اٹھائے جیسے اڑ جائے گی——— اس کے ہر قدم پر ریت یوں اڑنے لگی جیسے اس روز میں نے نرگس سے پہلی ملاقات پر پوچھنے اڑائی تھی!

دوسرے روز علی الصباح میں نے سنبل سے شکار کے بہانے سے اجازت مانگی۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی اور وہ لاشعوری طور پر میری انگلیاں دباتے ہوئے بولا۔ "آپ واپس آئیں گے؟ آپ سیدھے اپنے وطن کا رخ تو نہیں کر لیں گے؟"

"نہیں۔ نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے! بس ہفتہ بھر کے لیے اِدھر اُدھر گھوم گھام کر واپس آجاؤں گا۔ صحرائی دیہات میں میرے بہت سے شناسا ہیں۔ میں انہیں مل کر جلد لوٹوں گا۔

میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تم تو سب کچھ سمجھتے ہو!"

"جی ہاں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "سب کچھ سمجھتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ جلد لوٹیے گا۔"

اور جب میں سمن سے نکلا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا جیسی کوئی تتلی کسی بچے کی مٹھی میں بہت دیر تک قید رہتی ہے اور جب اس زنداں سے نکلتی ہے تو یوں تیز اور سیدھی پرواز کرتی ہے جیسے کائنات کے آخری سرے پر جا کر دم لے گی!

شام کو میں ایک اسٹیشن پر پہنچا۔ دہلی کا ٹکٹ لے کر گاڑی پر سوار ہوا۔ صبح سویرے دہلی جا اترا۔ اپنے بالا خانے پر پہنچا تو کتے میرے قدموں میں لوٹنے لگے۔ میرا بوڑھا ملازم منہ کھولے بھویں لٹکائے مجھے گھورنے لگا۔ "آپ گھبرائے ہوئے ہیں! آپ ہانپ کیوں رہے ہیں؟ آپ——— آپ میں ابھی پیر جما سے کوئی تعویذ گنڈا لاتا ہوں۔ میں نہیں کہتا تھا آپ پر بھوت پریت کا سایہ پڑ گیا ہے!"

میں نے زور سے قہقہہ لگایا اور ہنستا ہوا اوپر بالا خانے پر آیا تو اچانک رنگین شیشوں کی پرلی طرف انکم ٹیکس افسر صاحب کی ایک لڑکی میرے کمرے کی طرف یوں دیکھتی نظر آئی جیسے اس نے یہاں سے کوئی عجیب و غریب آواز سن لی ہے۔ میرے قہقہے رکے تو وہ آنکھیں جھپکانے لگی اور جب میں نے تازہ ہوا کے بہانے سے کھڑکی کھول دی کہ اب مجھے لڑکیوں سے وہ پہلی سی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی——— تو وہ جھٹ دیوار کے پیچھے چھپ گئی۔ لیکن دیوار میں بے شمار رخنے تھے جن میں سے میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے! جگنو سے چمکنے لگے میرے دل میں!——— زندگی تغیرات کا نام ہے اور خشک کھجوروں کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی چھوکری سے اینٹوں کی اس دیوار کے پیچھے دبکی ہوئی نیم پوشیدہ لڑکی کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کاغذ کے ایک پرزے

پر "مزاج شریف" کے الفاظ لکھے اور ایک کنکر پر لپیٹ کر اسے پرلی چھت پر پھینک دیا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی کیونکہ اب ملازم کتے باندھ کر میرے جوتے اتارنے آرہا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک کٹاک سے ایک رنگین شیشہ کرچی کرچی ہو کر فرش پر بکھر گیا اور ایک کاغذ میں لپٹا ہوا کنکر میری کنپٹی پر آن گرا ——— "کون ہے بے وقوف کا بچہ!" میرا نوکر چنگھاڑتا ہوا کھڑکی کی طرف لپکا" کون ہے اپنی ماں کا لاڈلا" ——— اور پھر اچانک پاؤں پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ شیشے کا ایک ٹکڑا اس کے پاؤں میں چبھ گیا تھا۔ بلبلاتا اور پتھر پھینکنے والے کو ہزاروں صلواتیں سناتا وہ سیڑھیاں اتر گیا۔ میں نے کنکر پر سے کاغذ اتارا۔ نسوانی طرز تحریر میں لکھا تھا۔

ے مزاج پوچھ کے رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں
وہ آئے تھے میرے دل کی لگی بجھانے کو

"باذوق معلوم ہوتی ہے!" میں نے چٹھی کھولتے ہوئے سوچا۔ ہاتھ کے اشارے سے میں نے اسے شعر کی رسید پہنچائی تو کھڑی ہو گئی۔ بہت دیر تک مجھے دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہے۔ "میری سب بہنوں کی شادی ہو چکی ہے اور میں یہاں تنہا رہ گئی ہوں۔ میرا یہاں اکیلے جی نہیں لگتا۔ مجھے ایک ساتھی کی تلاش تھی اور حیران تھی ——— کہ تم اتنے دنوں سے ان رنگین شیشوں میں سے نہیں جھانکے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ شکر ہے تم آگئے ——— شکر ہے ——— شکر ہے!" ——— اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اور آنچل سے اپنا چہرہ چھپاتی پرے چلی گئی ——— دیوار کے رخنے سے میں نے اس کی اونچی ایڑی کی گرگابی دیکھی اور میں سمجھا جیسے وہ اونچی نکیلی ایڑی میری پسلیوں کو چٹکاتی میرے دل میں دھنسی جا رہی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کنکر پھینکنے کا سلسلہ دو چار روز جاری رہا اور اگلی اتوار کی ایک دھندلی چاندنی رات کو میرا بالا خانہ لونڈر کی خوشبو سے

لبریز ہو گیا۔ اونچی ایڑی والی گرگابی جب میرے کمرے کے فرش پر پڑی تو میرے دل میں بے شمار شمعیں سی جھلملا اٹھیں۔ سنہرے بال بازوؤں پر بکھر گئے اور کجوروں کے آہنی سائے سرسراتے ہوئے خشک بالوں' پپڑیاں جمے ہونٹوں اور فولادی زانوؤں والی ایک چھوکری کو ساتھ لئے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے نکلتے جانے کدھر گم ہو گئے۔

دوستوں کی محفلوں میں میرے قہقہے بلند ہو گئے اور میرے سب احباب حیران ہونے لگے کہ لڑکیوں سے کترانے والا جنسی تعلقات کا موضوع چھیڑنے پر آنکھیں بند کر کے کارل مارکس کے اقوال گنگنانے والا خشک غضنفر اب ساقی سیمیں اور عارض گلگوں اور کاکل عنبر فشاں اور تبسم شرر بار کی باتیں کرنے میں سب سے بڑھ چڑھ کر کیوں حصہ لیتا ہے اور یہ کیا وجہ ہے کہ اسے جوش کے سارے "نقش و نگار" اختر کی ساری سلمائی نظمیں اور حافظ کے سارے خمریات ازبر ہو گئے ہیں ——— جی ہاں ——— وہ بے چارے یہ نہ سمجھ سکے کہ مرغابیوں اور ہرنیوں کا شکاری اب کجاوے میں جھولتی ہوئی اور بھونڈے زیوروں سے لدی پھندی لڑکیوں اور اونچی ایڑی کی گرگابیوں اور لونڈر میں بسی ہوئی زلفوں والی مسوں کا شکار کھیلتا ہے۔

میرا بوڑھا شکاری ملازم روزانہ دس بار مجھ سے کہتا۔ "آپ شکار پر کب جائیں گے؟ اب بڑھیا تو مر چکی جس کی مجھے فکر رہتی تھی۔ اب میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کتے بھی تیار ہیں اور آج کل شکار بھی عام ملتا ہے۔"

اور میں مسکرا کر کہتا۔ "کتے بیچ دو اور شکار کا ذکر چھوڑ دو۔ سامنے کھڑکی کے شیشے صاف کرو۔ اب میں شکار پر نہیں جاؤں گا۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں۔"

اور پھر اچانک اس شکاری کے سر پر ایک بادل زہرہ گداز کڑک پیدا کرتا ہوا ابھرا اور ایسی ژالہ باری ہوئی کہ کھیت دھنسے گئے' نالے چڑھ آئے اور

پگڈنڈیاں مٹ گئیں!!

دھند لکے

میرا شکار خلاف معمول دو تین روز میرے پاس نہ آیا اور میں ساری رات بالا خانے کی کھڑکیوں اور سیڑھیوں کو دیکھ دیکھ کر ترستا رہا اور جب ایک شام کو میں ہمایوں کے مقبرے پر سیر کو گیا تو ایک کنج میں مجھے ایک بنچ پر وہ ایک نوجوان کے زانوں پر سر رکھے لیٹی نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کون کہتا کہ اپنے منگیتر سے شادی سے پہلے ملنا خلاف تہذیب ہے۔ لیکن تم اپنے دوستوں میں یہ باتیں نہ کرنا کہ پرسوں منگنی ہوئی اور کل سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ کہیں گے — میں کوئی آوارہ چھوکری ہوں!"

"پگلی!" ہنستے ہوئے نوجوان نے جواب دیا۔

اور اچانک کھجوروں کے سائے سرسراتے ہوئے، لہراتے ہوئے بالوں، نارنجی ہونٹوں اور گداز زانوؤں والی ایک دوشیزہ کو ساتھ لئے کہیں سے آئے اور میرے دماغ کے اردگرد قیامت خیز تیزی سے گھومنے لگے۔

لڑکھڑاتا ہوا میں وہیں سے دہلی اسٹیشن پر پہنچا۔ صبح سویرے اسی ننھے اسٹیشن پر جا اترا اور پھر سمن کا رخ کر لیا۔

تیز دھوپ کی وجہ سے ٹیلے تپ رہے تھے اور ہر طرف ایک بھاپ سی اٹھ رہی تھی۔ دہکتی ہوئی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی لیکن میں حیران و ششدر، پریشان و پشیمان چلتا گیا —— چلتا گیا —— اور جب سورج مغربی ٹیلوں کی اوٹ میں غروب ہو گیا تو اچانک پورب کی طرف سے ایک آندھی اٹھی اور آن کی آن میں چار طرف چھا گئی۔ میری آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میرا لباس پھڑپھڑانے لگا۔ میرے قدم اکھڑ اکھڑ گئے۔ بولیں شوکنے لگیں اور ان دیکھے ہاتھ لپک لپک کر میرے گلے کو اس زور سے دبانے لگے کہ میرا دم گھٹ

گیا۔ میں بے دم ہو کر ایک جگہ گر گیا کہ اچانک تند جھونکوں کی پر خوف چیخوں میں مجھے ایک گیت سنائی دیا۔

آندھیو! اور زور سے چلو اور کائنات کو جڑوں سے اکھیڑ کر فضا میں لڑھکا دو۔

طوفانو! چیختے ہوئے آؤ اور کھجوروں کے جھنڈ اپنے شانوں پر رکھ کر افق پر غائب ہو جاؤ۔

گھٹاؤ! ژالہ باری کرو۔ اور سمن اور سوسن کی چراگاہیں دھنک کر رکھدو کیونکہ اے آندھیو، طوفانو اور گھٹاؤ!

اس دنیا نے محبت کو ایک وقتی کھیل سمجھ لیا ہے!

میں نے آواز پہچان لی۔ "سنبل۔ سنبل۔" میں پکارتا ہوا گرتے ہوئے طوفان میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔

اور پھر سامنے ایک اونٹ کا سایہ ابھرا۔ لپک کر میں اس کے قریب پہنچا اور چیخا۔ "سنبل۔ سنبل۔"

"آیئے غضنفر علی خاں صاحب۔ کیسے خیریت تو ہے۔"

"میں تمہیں ملنے آیا ہوں۔" میں نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔ وہ بے جان بت کی طرح کھڑا رہا اور پھر بولا۔ "شوق سے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔"

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"سمن سے۔"

"مجھے نرگس سے بھی ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"ملیئے۔" وہ اونٹ کی مہار کو اپنے انگلی کے اردگرد لپیٹتے ہوئے بولا —— "لیکن دیکھئے۔ وہ مصروف ہو گی۔ سورج غروب ہونے سے سورج طلوع ہونے تک وہ قریب قریب دس نوجوانوں سے ملاقات کر لیتی ہے۔ ہم نے اسے ایک کھلونا سمجھ کر پھینکا اور وہ ساری دنیا کے لیے کھلونا بن گئی۔ سنبل اور

غضنفر آج کل اس کے خوابوں کے بھوت ہیں! جائیے۔ ــــــ خدا حافظ۔"

اس نے مہار ڈھیلی کی اور آن کی آن میں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سایہ بن گیا۔ ہر طرف جھینگے سے ناچنے لگے اور جب میں اپنے تپتے ہوئے دماغ کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر چنگھاڑتے ہوئے اندھیرے میں ایک طرف منہ اٹھا کر چل دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل میں چمکتے ہوئے جگنوؤں کو اچانک کسی نے مٹھی میں دبا کر مسل ڈالا ہے!

کنگلے

سارے علاقہ پر مدت سے ایک بوند تک نہ پڑی تھی۔ لے دے کے "کرسی نشین صاحب" کا ایک کنواں تھا' وہاں پہرہ بٹھا دیا گیا کہ کوئی پانی نہ کھینچے۔ منہ اندھیرے لوگ سروں پر گاگریں لادے گاؤں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر جاتے جہاں جھیل کے کڑوے اور کھارے پانی سے اپنی پیاس بجھاتے۔ واپس آنے تک ان کے گلے چھل جاتے' لیکن بھوکا خاک چاٹ کر بھی جی سکتا ہے' پیاسا آنسو پی کر بھی زندہ رہ سکتا ہے' یہ تو جھیل کا پانی تھا۔

سارا دن گاؤں سے جھیل تک آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ مریل اونٹ جو اپنی کمزوری کی وجہ سے چلتے پھرتے بھوت معلوم ہوتے تھے' صبح کو گاؤں سے پیٹھ پر گھڑے لادے نکلتے اور چراغ جلے واپس آتے۔ سانپ بچھو کے خوف سے بے پروا ہو کر اب راتوں کو بھی لوگوں کا یہی مشغلہ تھا۔ بیکار انسان اگر اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹتا رہے تو بھی اسے یہ تشفی تو رہتی ہے کہ وہ کوئی کام کر رہا ہے۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ دن کا چین خواب و خیال ہو گیا۔ گلیوں میں خاک اڑنے لگی۔ چوپال پر کرسی نشین صاحب کا سرحدی حقہ دھوپ میں سوکھ کر بے رنگ ہو گیا۔ مسجد کے صحن میں مولوی جی نے "نیاز بو" کے جو چند پودے لگائے تھے زرد تنکے بن کر اڑ گئے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ آنکھوں میں ویرانی جھلکنے لگی۔ ابھری ہوئی پسلیاں اور تنے ہوئے پٹھے سکڑ کر بیجان رگوں میں تبدیل ہو گئے۔ نہ کبڈی کے میلے لگتے نہ کشتیاں ہوتیں

اور نہ ہل چلاتے وقت بیلوں کے مقابلے کی نوبت آتی۔ کوئی اکٹھا کام کرتے تو میراثی کو ڈھول بجانے کا موقع ملتا' اب وہ بیچارہ بھی کھاٹ پر بیٹھا پرانے ڈھولوں اور بوسیدہ شہنائیوں پر تیل ملتا رہتا کہ ان کے ظاہری حسن میں تو کمی نہ آئے۔ دو دو تین تین کی ٹولیاں بنکر لوگ گلیوں میں دیواروں کا سہارا لئے بیٹھے رہتے زور زور سے کھانستے۔ پوری قوت سے خاک پر تھوکتے اور پھٹے ہوئے بے رونق ہونٹ آستینوں سے پونچھ کر اوپر بھورے آسمان کی طرف دیکھتے۔ تپے ہوئے تانبے کی طرح آسمان کی وسعتیں لرزتی رہتیں اور زمین کے سینے سے بے پناہ پیاس کی وجہ سے ہر طرف دھواں سا اٹھتا معلوم ہوتا۔

ان کی گفت گو بھی کچھ اس قسم کی ہوتی'

"ارے کوئی نئی بات سنا۔"

"نئی بات؟ ——— آج جانوں کا گدھا بھری ہوئی گاگریں اٹھائے آ رہا تھا کہ اچانک بیٹھ گیا۔ گاگریں ٹوٹ گئیں اور جانوں میاں وہیں زور زور سے ہنسنے لگے۔ کہنے لگے۔ "گدھے تیرا قصور نہیں۔" پاس ہی مولوی جی سر پر گھڑا اٹھائے رینگتے آ رہے تھے' پلٹ کر بولے۔ "تو پھر کس کا ہے؟" جانوں بولا۔ "خدا کا۔"

مولوی جی لال پیلے ہو گئے' مسجد میں آ کر فتویٰ دے دیا کہ "جانوں کافر ہے' خدا کو نہیں مانتا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔" ہم سب ان کے پاؤں پڑے کہ حقہ پانی ملتا ہی کہاں ہے کہ بند کر دیا جائے' اور پھر انسان اپنے آقا سے شکایت کر ہی بیٹھتا ہے' پھر محتاط رہے گا۔ خدا خدا کر کے معافی تو جانوں کو مل گئی مگر ڈر گیا ہے بیچارا۔ سنا ہے مسجد میں ابھی تک نماز پڑھ رہا ہے۔ کہتا ہے قرآن شریف ختم کر کے اٹھوں گا یہاں سے' اور بارش ہوتے پر مسجد کا ٹوٹا ہوا مینار مرمت کراؤں گا۔ بے جانے بوجھے ایسا جرم کر بیٹھا۔"

پرلی گلی سے دو چار ادھیڑ عمر بزرگ رینگتے ہوئے آئے اور وہاں بیٹھ

گئے۔ "کوئی نئی بات سناؤ۔"

"اے نئی بات کیا ہوتی ہے۔" ایک ادھیڑ عمر بزرگ بھووں اور پلکوں سے دھول پونچھتے ہوئے بولا۔ "اللہ یار بیچارا دم توڑ رہا ہے۔ حکیم جی کہتے ہیں گیہوں کی گھنگنیاں کھائے تو شاید حالت پلٹ جائے' لیکن گاؤں بھر میں آج کل باجرہ اور جوار ہی پک رہے ہیں۔ گیہوں کہاں سے آئیں کہ نسخہ تیار ہو۔ کچھ عجیب سا جواب ملا۔ بولے۔ "جا کر کہیں مزدوری کر لے' مجھے تیرے دادا کا قرضہ تو نہیں دینا۔"

ایک نوجوان جھکی ہوئی دیوار کا سہارا لیکر اٹھا۔ "سچی بات کہی ملک نے۔ اسے پھلے آ' شہروں میں نکل چلیں۔"

پھلا خاک پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ بولا۔ "رہنے بھی دے حیات۔ وہاں پہلے سے ہی مزدوروں کی فوج موجود ہے۔ کون پوچھے گا ہمیں۔ ہر پیٹ والا مفلس کو مزدوری کی تلقین کرتا ہے' کرسی نشین صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کی!"

بارش کا موضوع اب ان کے لئے بہت فرسودہ ہو گیا تھا۔ کوئی بھولے سے یہ ذکر کر بیٹھتا تو سب لوگ منہ نوچ لیتے اور کہتے "اب بادل نہیں اٹھنے کے' اب بارش نہیں ہونے کی' ساون کا نام بدل دینا چاہئے!"

کچھ دنوں کے بعد علاقے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ضلع میانوالی کے دو ڈاکو بندوقیں لئے علاقے میں آ گھسے ہیں اور لوٹ مار کر رہے ہیں۔ سارا مجمع ہنس پڑا۔

"ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ خالی مٹکے اٹھا کر لے جائیں تو ان کی مرضی ورنہ ان کے پیٹ بھرنے کے لئے تو ہمارے پاس اس میدہ ایسی مہین دھول کے سوا اور کچھ نہیں!"

حیات اور پھلے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مجمع سے کھسک

کر ایک تنگ گلی میں آگئے۔

حیات بولا۔ "بھئی میرا خیال ہے ہم بھی کسی کھائی میں چھپ بیٹھیں۔ کوئی کھاتا پیتا گزرے تو دبوچ لیں اسے۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے نا۔ مانگنے پر نہیں دیتے نہ سہی' کوئی سبیل تو چاہیے نا آخر۔"

پھلا بولا۔ "رہنے بھی دے حیات' کیا گندی تجویز سوچی تو نے' کسی کا پیٹ چاک کر کے اپنا پیٹ بھر لینا' اس سے تو بہتر ہے کہ انسان طاعون سے مری ہوئی چوہیا کھا لے۔"

حیات گھبرا گیا۔ "تھوہ! متلا گئی میری طبیعت۔ لیکن یہ کرسی نشین لوگ بھی تو ہمارا پیٹ چاک کر کے ——"

"کوئی سن لے تو تھانے بھیج دے۔"

مریل مریل قدم اٹھاتے دونوں پھر مجمع میں واپس آگئے۔ وہاں ایک بوڑھے نے ایک تجویز پیش کر رکھی تھی کہ صاحب کے پاس سارے کا سارا گاؤں چلا جائے اور ہاتھ جوڑ کر پکارے کہ ان داتا۔ ہماری بھی کچھ فکر کر۔ ہم تیری پرجا ہیں۔ ہم پیٹ پر پتھر باندھے تھک گئے ہیں۔ انتڑیاں رسیاں بن گئی ہیں۔ بیٹھ جائیں تو اٹھا نہیں جاتا۔ سانس لینا بھی عذاب ہے۔ میں نے سنا ہے کہ صاحب ضلع دیسی ہے' دیسی بھائی ہماری فریاد سمجھے گا' شاید ترس کھا کر کوئی علاج کر ڈالے ہماری مصیبتوں کا۔"

حیات آگے بڑھ کر بولا۔ "ہاں' ہاں سنا ہے' اس کے پاس دس ہزار کی ایک موٹر ہے۔ ہو سکتا ہے ترس کھا کر ہمارے لئے موٹر بیچ ڈالے اور رقم ہم میں تقسیم کر دے۔ آخر پیدل چلنا کوئی گناہ تو نہیں اور وہ یہ سب باتیں سمجھتا ہو گا۔"

پھلا اسے کھینچتے ہوئے بولا۔ "لے بیٹھ بھی جا۔ کیا بھولی باتیں کرتا ہے۔ صاحب تیرے لئے موٹر بیچ ڈالے گا؟ کیا خواب دیکھ رہا ہے تو! قسم خدا کی

ہماری وضع قطع کے لوگ اس کے سامنے جائیں تو کتے چھوڑ دے ہمارے پیچھے چپراسی ہمیں دھن ڈالیں' پولیس ہمیں دبوچ لے۔ ہو سکتا ہے ہم سب حوالات میں ٹھونس دیئے جائیں۔"

"وہاں روٹی تو ملے گی نا۔" حیات بولا۔ "اس گھر سے حوالات بھلی ——؟"

پھلا چٹکی سے کان میں سے میل نکالتے ہوئے بولا۔ "اور ہمارے پیچھے ہماری بہو بیٹیاں' مائیں بہنیں بے شک تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔"

مجمع دم بخود رہ گیا۔ جہاں بہو بیٹیوں کی آن پر حرف آنے کا خوف ہو' وہاں یہ کنگلے تہی شکم لوگ کٹ نہ مریں؟ بوڑھوں کے ہونٹ لرزنے لگے۔ جوانوں کی چھاتیاں ابھرنے لگیں۔ بچے آنکھیں جھپکانے لگے۔ سب پھلے کو حیران نگاہوں سے گھورنے لگے! ایک بوڑھا لاٹھی کے سہارے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ختم بھی کرو یہ باتیں۔ کہاں کی بات تھی' کہاں آ کر رکی۔ میرا دماغ گھوم رہا ہے!"

مجمع منتشر ہو گیا۔ حیات اور پھلا اسی طرح گردنیں لٹکائے پاؤں گھسیٹتے تنگ اور ہرتی پھرتی گلیوں میں ہوتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں آ گرے۔

بھوک کی شدت سے لوگ مرنے لگے تو کسی پڑھے لکھے نے اخباروں میں دو سطریں چھپوا دیں۔ تب جا کر سرکار کو معلوم ہوا کہ چالیس پچاس ہزار کی آبادی میں الو بول رہا ہے۔ تجویز ہوئی کہ علاقے کے بڑے قصبے سے خان کوٹ تک ایک سڑک بنائی جائے۔ اور اس کے لئے ان بھوکے دہقانوں کو پانچ آنے روزانہ پر مزدور رکھا جائے!

سارا علاقہ بڑے قصبے پر ٹوٹ پڑا۔ حیات اور پھلا بھی مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ دو دن میں سڑک تیار ہو گئی۔ ایک خاص حصے سے کنکر اٹھا کر پرے پھینکنے تھے۔ پلک جھپکنے میں صفائی کر دی گئی۔ مزدوریاں لینے کا وقت آیا تو

سب کو اٹھنی ملی۔

حیات ہمت کر کے پکار اٹھا۔"اے بابو جی ہمیں دس آنے ملنے چاہئیں۔"

سارا مجمع چلا اٹھا۔"ہاں ہاں۔ ہمارا حق دس آنے ہے۔"

پھلے نے حیات کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔"اے چپ رہو حوالات بھیج دیئے جاؤ گے۔"

"مگر ہماری روٹی کیا ہوئی؟"

"اے چپ رہ بھائی۔ بابو جی بھی تو نگرانی کے دام لیں گے۔"

"مگر کیا تنخواہ نہیں پاتا؟" حیات نے پوچھا۔

"پاتا ہے مگر تھوڑی ہوتی ہے نا تنخواہ۔ اوپر کی آمدنی آئے تو ان کا کام چلے"!

"کتنی ہوگی اس کی تنخواہ؟"

"چالیس روپے"!

"چالیس روپے؟ خدا کی قسم مجھے مہینے میں چالیس روپے ملیں تو سال کے بعد پنڈی جا کر موٹر خرید لوں۔"

مجمع منتشر ہو رہا تھا۔ حیات اور پھلا قصبے میں ایک غریب دوست کے گھر سے اپنی گودڑیاں اٹھاتے گئے۔ رستے میں انہیں ایک بہت بڑا اژدہام نظر آیا۔ ایک اونچی جگہ پر کرسیوں میں بڑے بڑے طروں والے لوگ بیٹھے حقے پی رہے تھے۔ نیچے خاک پر غریب کسان بیٹھے کھانس رہے تھے اور ایک نورانی داڑھی والے مولوی صاحب باہیں پھیلا پھیلا کر زور زور سے چلا رہے تھے!

حیات بولا۔"ہماری بری حالت دیکھ کر کوئی تعویز کر رہی ہے سرکار۔"

پھلا بولا۔"اے سن تو سہی۔ ہماری بھوک کی کسے خبر۔ یہ تو اپنے پیٹ

بھرنے کے دھندے ہیں۔"

مولوی جی کی آواز آ رہی تھی۔"آزادی ہماری آخری منزل ہے۔ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے' ہم آزاد ہو کر رہیں گے' ہم اپنے گھروں میں غیروں کے دست نگر نہیں ہو سکتے۔ غلامی کے عفریت کی بوٹیاں چبا ڈالیں گے ہم۔ ہم محکومی کے دیو کی ہڈیاں پیس دیں گے۔ ہم آزاد ہیں۔ ہم آزاد ہیں' بولو۔ انقلاب۔"

سوکھی ہوئی پسلیاں پھیلیں اور زخمی گلوں سے مری مری آوازیں بلند ہوئیں۔

"زندہ باد۔"

بڑی بڑی پگڑیوں اور لمبے لمبے طروں والے آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔

جب وہ حیات اور پھلے کے قریب سے گزرے تو دونوں نے غور سے ان کی باتیں سنیں۔

"سرکار کا دشمن ہے۔"

"باغی ہے باغی۔"

"بڑا دھوکا ہوا۔"

"میں سمجھا تھا کوئی قصہ سنائے گا۔"

"خفیہ پولیس والے رپورٹ نہ کر دیں ہماری۔"

"میں نے تو کل ہی نمبرداری کی درخواست دی تھی۔"

"بڑے صاحب نے یہ بات سن لی کہ میں بھی اس جلسہ میں شریک تھا تو میری دعوت کیسے قبول کریں گے۔"

"ملک محمد زماں اور چودھری فتح دین ابھی بیٹھے ہیں؟"

"نہیں' آ رہے ہیں ہمارے پیچھے۔"

"کھسک چلو۔"

حیات کا دماغ گھومنے لگا۔ سوچا۔ یہ کیا غضب ہوا! ایسی کیا بات کہہ دی مولوی جی نے کہ بھا گئے بڑے آدمی!

واپس آتے ہوئے حیات نے پھلے سے کہا۔ "پھلے بھیا۔ سچ کہوں۔ مولوی جی کی باتوں نے موہ لیا مجھے۔ بڑا رس تھا ان کے بولوں میں۔ میں اب گلی گلی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاؤں گا۔"

"مگر میں ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ آخر کیا چاہتے تھے مولوی جی۔"

"بھئی سمجھا تو میں بھی نہیں۔ یونہی ان کی بات دل کو لگی۔ مطلب تو میں بھی نہیں سمجھا۔"

سر پر گودڑیاں۔ پگڑی کے ایک سرے پر اٹھنی بندھی ہوئی۔ سوکھے جھریاں پڑے چہرے۔ رینگتے ہوئے گاؤں کے نزدیک پہنچے تو انہیں کرسی نشین صاحب کے مکان کے سامنے گلی کے سرے پر بہت سے آدمی کھڑے نظر آئے۔ تیز تیز قدم اٹھانے لگے کہ کہیں فساد تو نہیں ہو گیا۔

انہیں آتا دیکھ کر دو چوکیدار اور کرسی نشین صاحب آگے بڑھے۔ ایک چوکیدار بولا۔ "اے حیات۔ اے پھلے۔ کمالائے ہو کچھ؟ کیا تم نے کچھ نہیں سنا؟ کل ہمارے گاؤں کی حالت دیکھنے کے لیے صاحب ضلع تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی آمد کی خوشی میں ہم ایک بڑا آرائشی دروازہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں جس پر بہت کام کیا جائے گا۔ یہاں سے کرسی نشین صاحب کی چوپال تک جھنڈیاں لٹکائی جائیں گی۔ ہر گھر سے رقم اکٹھی ہو رہی ہے۔ اٹھنی اٹھنی تم بھی لاؤ۔"

حیات دم بخود ہو کر بولا۔ "دو دن پتھر ڈھوتے ڈھوتے ہماری کمریں ٹوٹ گئیں اور خون پسینہ ایک کر کے جو پھل ملا اسے تمہارے قدموں میں دھر دوں' یہ کہاں کی شرافت ہے؟"

کرسی نشین صاحب گرج اٹھے۔ "ارے نکال اٹھنی ورنہ دس نمبر میں

چالان کرا دوں گا۔ بہت باتیں نہ بنا۔"

پھلے نے حیات کو ٹہوکا دیا۔ "کھول دے بھئی۔ یہ بچھو جھنک دے۔ ہمیں پیسہ راس نہیں" ——— مضمحل ہاتھ پگڑیوں کے کنارے کی طرف بڑھے اور دو اٹھنیاں کھنکتی ہوئی کرسی نشین کے زریں جوتوں کے پاس آ گریں۔

"ان کے سنہرے کاغذ لئے جائیں۔" کرسی نشین صاحب بولے۔ "اور اے حیات۔ تم دونوں اپنے بستر اس چٹان پر رکھ دو اور ذرا یہ دو شہتیر گاڑ دو۔ دروازہ کھڑا ہو جائے تو دوسرا کام شروع ہو گا۔"



فقیر سائیں کی کرامات

افسانہ گو:- کل کی بات ہے کہ تارہ گاؤں کی جنوبی چراگاہوں کے ایک اندھیرے کنج میں ایک نوجوان چرواہا نیم کے چھتناروں کے سائے میں سو رہا تھا‘ کہ اچانک ——— دور ایک لڑکی زور زور سے چیختی اور بھاگتی ہوئی آتی ہے اور نوجوان چرواہے کے قریب آگرتی ہے۔ادھر اُدھر بیٹھی ہوئی بھیڑیں بکریاں تتر بتر ہو جاتی ہیں۔ چرواہا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور خواب آلودہ آواز میں کہتا ہے

نوجوان:- کیا ہے؟ کون ہو تم؟ اتنا چیخ کیوں رہی ہو؟

چرواہی:- (خوفزدہ آواز میں) سانپ۔ سانپ!

نوجوان:- (گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے) کہاں ہے سانپ؟ کدھر ہے؟

چرواہی:- (انگلی اٹھا کر)۔ وہاں۔ وہ جوہڑ کے کنارے بوڑھے شیشم کی جڑ میں۔ اتنا بڑا۔ میرے بازو جتنا موٹا۔

نوجوان:- شیشم کی جڑ میں؟ (ہنستا ہے) اری بھولی۔ تم شاید ادھر پہلی بار آئی ہو۔ شیشم کی جڑ والے سانپ نے آج تک کسی کو نہیں ڈسا۔ اس کا رنگ کالا ہے نا؟ اور کالے سانپ ڈسا نہیں کرتے ——— کالے سانپ فقیر ہوتے ہیں ——— اللہ والے۔

چرواہی:- لیکن اس کی آنکھیں چنگاریوں کی طرح چمک رہی تھیں ——— اس نے اپنی زبان ہلائی تھی مجھے دیکھ کر!

نوجوان:- تو اس میں خوف کی کونسی بات ہے ——— کیا تم ہر روز سینکڑوں جانداروں کی آنکھوں کو چمکتے اور زبانوں کو ہلتے نہیں دیکھتیں؟ ——— لیکن تم ہو کون؟

چرواہی:- میں ادھر ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ابا نے جنگل کے داروغہ سے اس چراگاہ میں بھیڑیں بکریاں اور گائے بیل چرانے کی اجازت لے لی ہے۔ آج میں پہلی بار یہاں آئی ہوں لیکن یہ چراگاہ تو بہت سونی ہے!

نوجوان:- واہ! یہ نرم نرم سبزہ۔ یہ ہرے ہرے گنجان نیم۔ وہ اودے پربت۔ وہ پربت کے قدموں میں نیلی جھیل۔ یہ جوہڑ۔ یہ جوہڑ کے کنارے پر بوڑھا شیشم اور پھر یہ نیم کے چھتناروں کے سائے ——— اری یہ جگہ سونی ہے! (ہنستا ہے)

چرواہی:- لیکن ہمارے گاؤں کی چراگاہیں تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ وہاں ننھے ننھے جھرنے ہیں۔ آئینہ نہ ملے تو ان میں چہرہ دیکھ لو اور پھر ان جھرنوں کے کنارے رنگ رنگ کے پھولوں کی قطاریں ——— وہاں سب چرواہوں اور چرواہیوں کے پاس بنسریاں ہوتی ہیں اور وہ سب اتنا اچھا گاتی ہیں جیسے بہت سی شہنائیاں اکٹھی بج رہی ہوں۔

نوجوان:- اور یہاں!

چرواہی:- یہاں تو میں جدھر جاتی ہوں۔ چرواہے پڑے سو رہے ہیں اور چرواہیاں بیریوں پر پتھر برسا رہی ہیں۔ ادھر ایک بیر زمین پر گرا ادھر سب کی سب گتھم گتھا۔ کسی کی اوڑھنی پھٹ گئی تو کسی کی بالی گر گئی۔ اس کے بندے پچک گئے تو اس کی نتھنی ناک کو چیرتی دور جا گری ——— اور پھر بوڑھے شیشموں کے نیچے کالے کالے اتنے اتنے سانپ ———!

نوجوان:- تمہاری باہوں جتنے موٹے! (زیر لب مسکراتا ہے)

چرواہی:- تم مذاق کرتے ہو ——— اللہ قسم میں نے اتنا بڑا سانپ دیکھا ہے

نوجوان :- اور میں کب کہتا ہوں کہ نہیں دیکھا ـــــ دیکھا ہو گا۔ اتنا موٹا ہو گا۔ اتنا ہی بھرا بھرا ـــــ اور ملائم ـــــ اور ـــــ اور زہری!

چرواہی :- (کڑک کر) بدمعاش لچا! (اٹھ کر جانے لگتی ہے)

نوجوان :- جاتی ہو؟ ـــــ لیکن وہ دیکھو ابھی تک شیشم کے نیچے کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ کچھ نہیں نظر آ رہا تمہیں؟ کیا خشک پتوں کو چیختے نہیں سن سکتی؟ فقیر سائیں شاید ادھر ہی کا رخ کر رہے ہیں!

چرواہی :- (پھر وہیں بیٹھ جاتی ہے) اب ـــــ اب میں واپس کیسے جاؤں گی!

نوجوان :- ٹھہرو۔ میں بنسری بجاتا ہوں' فقیر سائیں وہیں مست ہو کر جھومنے لگیں گے۔

چرواہی :- تمہارے پاس بنسری ہے؟

نوجوان :- ہاں۔ (بنسری نکالتا ہے) اور میں گاتا بھی ہوں۔

چرواہی :- (مسرت آمیز تعجب سے) تم گاتے بھی ہو؟

نوجوان :- ہاں۔ ایسا اچھا گاتا ہوں کہ تم سن لو تو اپنے گاؤں جانے کا نام نہ لو۔

چرواہی :- تو بڑا منہ پھٹ ہے رے!

نوجوان :- لیکن یہ تو تمہارے ہی سوال کا جواب تھا۔

چرواہی :- میں جاتی ہوں ـــــ اس موئے سانپ کی طرح تیری آنکھیں بھی چمکنے لگی ہیں (اٹھ کر) اب کدھر گیا سانپ!

نوجوان :- وہ کالی کالی لہراتی لکیر نظر نہیں آ رہی تمہیں ـــــ وہ شیشم کے تنے سے کچھ ادھر ہٹ کر۔ وہ جھاڑی کے پاس!

چرواہی :- مجھے تو کچھ نہیں دکھتا۔

نوجوان :- خوف نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ (بنسری سے ایک سریلی اور تیز آواز نکال کر رک جاتا ہے)

چرواہی :- (شوق بھری آواز سے) بجاؤ۔

نوجوان :- لیکن تم بیٹھتی کیوں نہیں! ـــــ ایں ـــــ اُدھر نہیں۔ ادھر۔ یہاں میری چادر پر ـــــ ہچ ہچ ہچ جوتے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اطلس اور کمخواب کا فرش تو نہیں۔ یہ تو ایک غریب چرواہے کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

چرواہی :- بجاؤ!

نوجوان بنسری بجاتا ہے اور اس سے ایسے رسیلے اور سہانے سر نکالتا ہے کہ چرواہی جھومنے لگتی ہے اور جب وہ بنسری سبزے پر دھر دیتا ہے تو چرواہی نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔

چرواہی :- بہت اچھی بجاتے ہو۔ بنسری کے سارے انگ تمہاری انگلیوں کی پوروں کے بس میں ہیں!

نوجوان :- اور میری انگلیاں خدا جانے کس دھن کے تال پر ناچتی رہیں ـــــ میں اپنی بنسری سے ایسے سر پہلے کبھی نہیں نکال سکا۔ آج تو مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی چراگاہیں بنسری کی الاپوں میں لپٹی ہوئی میرے ارد گرد چکر لگا رہی ہیں اور میں ـــــ

چرواہی :- (دبی دبی ہنسی کے ساتھ) ہے ہے۔ میں تو بھونچال سے بہت ڈرتی ہوں اور تو نے ساری چراگاہوں کو گھما دیا۔

نوجوان :- بات کاٹنے میں تمہیں خاص دسترس حاصل ہے۔ ذرا آگے بھی تو سن لیا ہوتا۔

چرواہی :- کیا۔ آگے کیا؟

نوجوان :- اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے ـــــ!

چرواہی :- جیسے؟

نوجوان :- جیسے ـــــ جیسے ـــــ (اور پھر کہیں دور دیکھتے ہوئے نہایت تیزی سے بولنے لگتا ہے) جیسے تم ان الاپوں کے سحر سے اٹھ کھڑی ہوئی ہو۔ تمہاری زلفیں ہوا میں اڑ رہی ہیں۔ تمہاری اوڑھنی پھڑ پھڑا رہی ہے۔ تمہاری

کالی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ تمہارے نارنجی ہونٹ کپکپا رہے ہیں اور گھومتی ہوئی چراگاہوں کے پس منظر میں تم آسمانوں پر رہنے والی ایک حور معلوم ہوتی ہو——اور اب کہ بنسری کا سحر ختم ہو چکا ہے' تم اپنے پر پھڑپھڑاؤ گی اور آنکھ کی جھپکی میں آسمان کی نیلاہٹوں میں گھل جاؤں گی' تم——

چرواہی :- بس——دیکھ رے چھوکرے——میں سانپ سے ڈر کر ادھر آئی تھی اور تیرا فرض تھا کہ تو مجھے میرے مویشیوں تک پہنچا آتا اور پھر یہاں آ کر اسی طرح مزے سے سو جاتا۔ یہ جو تو ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کے قصوں والی باتیں لے بیٹھا ہے' یہ مجھے بہت بری لگ رہی ہیں اور کان کھول کر سن لے کہ میں ایسے زبان درازوں کی گردنیں ناپنے میں بھی تاک ہوں جو مجھے گڑیا سمجھ کر مجھ سے کھیلنا چاہیں۔ سن رہا ہے تو؟ ارے تو نے مجھے بنسری کے دو چار میٹھے سر سنا دیئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو نے مجھے خرید لیا اور اب وارث شاہ کی لکھی ہوئی باتیں دہرانے کا تجھے پورا حق حاصل ہو گیا! بھولے اس راہ پر سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے ورنہ کوئی ہیر یا سوہنی کبھی تیرے تالو پر جوتے چٹخا کر چلتی بنے گی۔

نوجوان :- قیامت تک یہ نوبت نہیں آ سکتی کیونکہ تم پہلی اور آخری لڑکی ہو جس کے قدموں پر میں نے اپنے نغمے نچھاور کئے ہیں۔

چرواہی :- اور شاید میں ہی پہلی لڑکی ہوں جو اپنی جان کے خوف سے تمہارے اس قدر قریب آ گئی اور تمہاری تیلیوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں۔

نوجوان :- اوہ——یہاں روزانہ سینکڑوں لڑکیاں لنڈوری چڑیوں کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں۔ سب میری بنسری کی تانوں کو سراہتی ہیں——سب میرے اس قدر قریب آ جاتی ہیں کہ ان کے بال میری باہوں کو اور ان کی سانسیں میری کنپٹیوں کو چھونے لگتی ہیں۔ لیکن پگلی——نغمے پیدا کرنے والے کاغذ کی ناؤ نہیں ہوتے کہ جدھر سے کوئی لہر اٹھے ادھر ہی بہ نکلیں گے۔ یہ تو فولادی چٹانیں ہوتی ہیں۔

چرواہی :- لیکن یہ فولادی چٹان اپنی جگہ سے اکھڑ کیوں رہی ہے؟

نوجوان :- یہی تو بات ہے——اور تمہارے سوال کا جواب خود تمہارے پاس ہے۔

چرواہی :- لیکن اگر مجھے اپنے سوال کا جواب معلوم ہوتا تو میں سوال کرتی ہی کیوں؟

نوجوان :- (مسکرا کر) کیونکہ یہ بھی تم خوبصورت آنکھوں والیوں کی ایک مقناطیسی ادا ہے!

چرواہی :- دیکھ رے۔ اتنا کھل کر باتیں نہ کر۔ لگام دے اپنی کترنی کو' میں کوئی آوارہ لڑکی تھوڑی ہوں کہ تیری ان چکنی چپڑی باتوں سے پھسل پڑوں——میری منگنی ہو چکی ہے!

نوجوان :- اور یہی حال میرا ہے۔ میں بھی تو کسی اجنبی لڑکی کا منگیتر ہوں۔ ابا کہتے ہیں وہ خوبصورت ہے اور دودھ بلوتے ہوئے ایسے ایسے اچھے گیت گاتی ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں اس کے گانے سننے کیلئے چھپ چھپ کر چھتوں پر چڑھ آتی ہیں اور دیر تک کھٹی پڑی رہتی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ کسی لڑکی کو دیکھے بغیر بیاہ کر لینا پرلے درجے کی نادانی ہے' ہو سکتا ہے وہ کوئی چڑیل ہو——اکھڑ اور پھوہڑ——ہو سکتا ہے اسکی آنکھیں صرف سرمے کی دھار سے خوبصورت لگتی ہوں اور اسکے ہونٹ صرف رنگ سے گلابی بنائے گئے ہوں اور وہ صبح کو اٹھے تو میرے سارے خوابوں پر بھتنے ناچنے لگیں۔ تمہارا کیا خیال ہے ایسی منگنی کے متعلق؟

چرواہی :- ایسی باتیں لڑکیوں سے پوچھی جاتی ہیں؟——گیت بنانے والے پاگل ہوتے ہیں۔ میں تو راتوں کو بستر پر پڑی روتی رہتی ہوں کہ ابا نے مجھے چھوڑی ہوئی ہڈی کی طرح اٹھا کر پرے کیوں پھینک ڈالا۔ جانے وہ کون ہے۔ کیسا

ہے ـــــ اگر وہ کوئی بڑی بڑی مونچھوں والا آبنوسی رنگ کا ہٹا کٹا بھینسا نکل آیا تو اللہ قسم میں تو یہیں کہیں چٹان پر سے کود پڑوں گی، اس موئے بھوت کے چنگل میں عمر بھر پھنسے رہنے سے تو یہی بہتر ہے کہ میری نعش نیچے درختوں پر اٹک جائے اور چیلیں اور گدھ میری بوٹیاں نوچ نوچ کر ـــــ (اسکی آواز بھرا جاتی ہے نوجوان اس کے ہاتھ کو ہولے ہولے تھپکاتا ہے)

نوجوان :- تم تو رو دیں۔ تم لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہو، من کو ذرا سی ٹھیس لگی اور نین چھلک پڑے۔ قسمت پر بھروسا رکھو ـــــ اور دیکھو۔ تم اب اس طرف پھر بھی کبھی آؤ گی؟

چرواہی :- (اچانک ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور آنسو پونچھتی ہے) دو مہینے تک مویشی ادھر ہی لانے پڑیں گے۔

نوجوان :- اور کبھی نیموں کے اس چھتنارے کا بھی رخ کرو گی؟

چرواہی :- اگر سانپوں نے راستہ نہ روکا۔

نوجوان :- کالے سانپوں کے سوا مجھے کوئی اور سانپ نظر آ جائے تو اللہ قسم کے سر پر ایڑی رکھ کر ایک بار گھوما ہوں اور سب کچھ چُرمُر کر کے دھر دیتا ہوں۔ لیکن کالے سانپوں سے خوف کیسا۔ یہ تو فقیر ہوتے ہیں۔ کسی نے چھیڑا تو پل پڑے ورنہ کہیں دبکے بیٹھے رہے۔ نہ کسی سے دشمنی نہ دوستی۔ بس اللہ سے لو لگائے کنڈلی مارے پھنکارتے رہتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے ابا نے کہا تھا کہ نورے ـــــ اگر کہیں کالا سانپ ـــــ

چرواہی :- کیا نام ہے تمہارا؟

نوجوان :- نورا ـــــ نور محمد۔

چرواہی :- (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر) اور تمہارے ابا کا نام؟

نوجوان :- (حیران آواز میں) بہادر ـــــ بہادر خاں۔

چرواہی :- اوہ!

چرواہی گھبرا کر اٹھتی ہے اور جوتے گھسیٹتی بوڑھے شیشم کی طرف بھاگنے لگتی ہے۔ نوجوان ایک دو لمحے حیرت زدہ کھڑا رہتا ہے اور پھر پکارتا ہے۔

(چرواہی رک جاتی ہے اور سر جھکا لیتی ہے)

نوجوان :- اری تم اتنی گھبرا کیوں گئی ہو۔ لو یہ بدماش لچا تمہیں تمہارے مویشیوں تک پہنچا آئے (دو قدم اٹھا کر رک جاتا ہے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھتا ہے) لیکن تمہارا کیا نام ہے؟

چرواہی :- میرا ـــــ میرا ـــــ میرے ابا کا نام اللہ دین ہے!

(چرواہا ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر قہقہے لگاتا ہوا سبزے پر لوٹ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ کہتا ہے)

نوجوان: ابا کہتے ہیں ہونے والی بیویوں کو بیاہ سے پہلے دیکھنے والے نوجوان دوزخ میں جھونکے جاتے ہیں! ہا ہا ہا ہا ـــــ کیسی الٹی بات! ـــــ ہا ہا ہا ہا!!

☆

گونج

شہروں اور دیہات سے دور وہ ایک پربت کی چوٹی پر اپنے ماں باپ اور ننھے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گاؤں میں کاٹا تھا' لیکن جب ان کا شباب ڈھل گیا اور انہیں گاؤں سے اتنی دور کھیتوں کی دیکھ بھال کے لئے آنا جانا دشوار محسوس ہونے لگا تو وہ گاؤں سے اٹھ کر اس چوٹی پر آ گئے جس کے قریب ہی ایک تنگ سی پتھریلی وادی میں ان کے کھیت تھے۔ پتھروں کے دو گھروندے کھڑے کر کے انہیں سفید مٹی سے لیپ پوت دیا اور ایک طرف گائے بکری کے لئے خار دار جھاڑیوں کی نیم دائرہ بناتی ہوئی باڑ کھڑی کر دی۔ سات آٹھ دن کے بعد بوڑھا اپنی بھاری بھر کم لٹھ ٹیکتا ہرتی پھرتی پگڈنڈیوں پر سے اتر کر نیچے گاؤں جاتا اور صابن' گڑ' نمک مرچ' تیل اور گاہے ماہے اپنی بیٹی عمراں کے لئے ولایتی کپڑا خریدتا۔ عمراں یہ کپڑا خود سیتی اور جب پہن کر ایک میلا سا آئینہ دیکھتی تو کہتی۔ "ماں یہ کپڑا کتنا شریر ہے۔ چین ہی نہیں آتا اسے۔ تڑپے جا رہا ہے!" ــــــ اور ننھا شاہ محمد منہ بسور کر کہتا۔ "ہم بھی عید پر ایسا ہی کپڑا خریدیں گے؟"

دن بھر چھاج پھٹکے جاتے۔ کنکروں بھرا صحن صاف کیا جاتا۔ بھدے چولھے میں پتلی سوکھی شاخوں سے دھڑ دھڑ آگ جلائی جاتی اور رات کو ماں بیٹی مل کر خدا کی حمد اور رسولؐ کی نعت گاتیں۔ گاگر بجتی۔ تالیاں ایک خاص تال پر پٹتی جاتیں اور جب آوازیں بلند ہوتیں تو اندھیری پہاڑیاں گونج اٹھتیں۔ ہوا

انگڑائیاں لیتی اور چاند مسکرانے لگتا!

ننھا' جسے اسکول میں زبردستی "بھرتی" کر لیا گیا تھا' کہتا "میں تعریف اس خدا کی" گاؤں تو حیران رہ جاؤ تم دونوں۔ پر میں کیا کروں۔ مجھے گھڑا بجانا نہیں آتا۔"

عمراں کہتی۔ "لے تو گا۔ میں گھڑا بجاتی ہوں۔"

شاہ محمد شریر لہجے میں جواب دیتا۔ "میں گاگر کے ساتھ نہیں گا سکتا۔"

بوڑھا اپنے حقے کو گھما کر دیوار سے لگاتے ہوئے کہتا۔ "تو بڑا بیہودہ ہے شاہو' تجھے ضرور گانا پڑے گا۔ لے گا۔ ورنہ باہر اونچی نگر سے نیچے دھکیل دوں گا۔" ــــــ اور بوڑھا پھٹی پھٹی آواز میں "روں راں" شروع کر دیتا۔ شاہ محمد تھوک نگل کر خدا کی حمد گاتا اور جب اس کے گال شہ دانہ کی طرح لال ہو جاتے' گلے کی رگیں ابھر کر پھڑکنے لگتیں اور صاف آنکھوں میں پانی بھر آتا تو عمراں کہتی۔ "جانے کیا گایا تو نے۔ خاک بھی پلے نہیں پڑا۔ کیسے اول جلول بول تھے اس کے۔ ابا' اسے مدرسے سے اٹھوا لو۔"

شاہ محمد بھی آنکھیں جھپکا کر کہتا۔ "ہاں ہاں اچھے ابا۔ نئے منشی جی نے مجھے کل ماں کی گالی دی تھی!"

بڑھیا تڑپ اٹھتی۔ "موا پھانسی پر لٹکے' عینک ٹوٹے اس کی۔ اور شاہو۔ تو نے گالی سن لی اور چپکا بیٹھا رہا۔ زبان نہ کھینچ لی گدی سے؟ انگارہ نہ دھر دیا زبان پر؟"

ننھا گھبرا کر کہتا۔ "پر مدرسے میں انگارہ کہاں سے لاتا میں؟"

"انگارہ کہاں سے!" بڑھیا مرجھائی ہوئی انگلیوں میں نسوار کی ڈبیا گھما کر بڑبڑاتی۔ سب ہنسنے لگتے اور بوڑھا کھانسی کو بہت مشکل سے روک کر کہتا۔ "نہیں نہیں۔ میرا ننھا پڑھے گا اور جب "منڈل" پاس کر لے گا تو یہیں پٹواری بن جائے گا۔"

یہ سن کر شاہ محمد اچھل پڑتا۔ کان پر قلم رکھ کر لمبے لمبے قدم اٹھا کر چلتا اور کہتا۔ "پانچ روپے لاؤ تو یہ زمین تمہارے نام لکھ دوں!"

قہقہوں سے پربت کی یہ بلندی گونج اٹھتی۔ اور پھر مجروم عمراں گاگر اٹھاتی۔ چوٹی کے اتر میں چٹانوں سے گھرے ہوئے ایک چشمے کی طرف روانہ ہو جاتی۔ ٹھنڈا صاف پانی گول مول سنگریزوں پر تھرک رہا ہوتا اور آس پاس نرم نرم بھیگی ہوئی گھاس لہرا رہی ہوتی۔ قریب ہی درختوں پر چڑیاں چہچہاتیں اور بہت نیچے گاؤں پر گہری کہر کا پردہ دھیرے دھیرے اٹھنے لگتا۔ وہ چشمے میں منہ ہاتھ دھوتی۔ گاگر کو اندر باہر سے رگڑتی اور اسے بھر کر جب اوپر چوٹی کی طرف جاتی تو چھلکتا ہوا پانی اس کا دوپٹہ بھگو ڈالتا۔ اس کا چولا کئی جگہ پر اس کے جسم سے چپک سا جاتا اور کئی بار جب سامنے سے تیز ٹھنڈی ہوا چلتی اور اس کا لباس پیچھے کی طرف اڑ اڑ کر پھڑپھڑانے لگتا تو اپنے اعضا کے قوسی خطوط کو واضح ہوتے دیکھ کر وہ گھبرا جاتی۔ کئی بار دوپٹے کو سینے پر پھیلانے کی کوشش میں گاگر توڑ بیٹھتی۔ وہ جانتی تھی کہ آس پاس کوئی دیکھنے والا موجود نہیں لیکن وہ ان دنوں خود اپنے آپ سے شرماتی تھی اور اکثر سوچا کرتی تھی کہ اسے گھر سے باہر قدم تک نہیں دھرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ماں باپ بہت بوڑھے تھے۔ بھائی بہت چھوٹا تھا اور پھر یہ تیز گستاخ ہوائیں بھی تو ہر روز نہیں چلتی تھیں۔

کبھی کبھی باپ اسے کھیتوں کی رکھوالی کے لئے بھیج دیتا۔ وہ دیر تک سفید اور سرخ چٹانوں پر بیٹھی رہتی۔ کئی بار خدا کی حمد گنگنانے لگتی۔ کئی بار آسمان کو گھورتی رہتی اور جب اس کے ہاتھ میں کوئی تنکا آ جاتا تو اس کے اتنے ذرا ذرا سے ٹکڑے کرتی کہ انہیں دیکھ کر وہ خود حیران رہ جاتی تھی۔ کھیتوں کی پتھریلی میندوں پر چلتے ہوئے اسے بڑی عجیب عجیب سوچیں آتیں۔ پہاڑی پھول توڑ کر بالوں میں سجاتی۔ جھرنوں میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہتی۔ اور جب شام پڑے گھر کی راہ لیتی تو کوئی احساس اسے مجبور کرتا کہ وہ یہیں کھیتوں کے کنارے

پڑی رہے ــــ اکیلی ــــ چپ چاپ ــــ پر اسرار آسمان کو گھورتی رہے اور پھر انہی صاف چٹانوں پر سو جائے۔ صبح ہو اور پھر یہی سلسلہ شروع ہو جائے۔ لیکن کئی مرتبہ اسے کھیتوں کی طراوت بخش وسعتوں میں ایک کمی سی محسوس ہوتی اور جب اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا تو وقت سے پہلے گھر چلی جاتی۔ اور پھر جب گاگر بجتی اور خدا کی حمد اور رسول کی نعتیں گونجتیں۔ جب شاہو عجیب عجیب شکلیں بنا کر منشی جی کے تازہ کارنامے سناتا۔ جب بوڑھا حقہ گڑگڑا کر پیروں فقیروں کے قصے کہتا تو عمراں کے دل پر سے بوجھ اتر جاتے۔ وہ اپنے آپ کو بیحد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتی۔

لیکن جب اس کا بھائی مدرسے چلا جاتا، ماں کھیتوں کی رکھوالی کرتی اور باپ سودا خریدنے کے لئے گاؤں کا رخ کرتا تو وہ دیر تک بہت نیچے گاؤں کے آخری سرے پر مدرسے کو دیکھتی جو وہاں سے کھلونا سا لگتا تھا۔ اور جب لڑکوں کو چھٹی ہوتی اور ننھے ننھے دھبے ادھر ادھر رینگنے لگتے تو وہ اس جھرمٹ میں سے ایک ننھے سے دھبے کو اپنی طرف آتا دیکھتی۔ یہ دھبہ لحظہ بہ لحظہ واضح ہوتا جاتا اور جب شاہو تختی اور بستے کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے اپنے سر پر جمائے ہانپتا ہوا اس کے پاس آ کر کہتا۔ "اللہ کرے آگ لگ جائے مدرسے میں!"

ــــ تو عمراں اسے گلے سے لگا لیتی۔ اسے چومتی۔ اس کے گدگدیاں کرتی۔ اور جب وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر ناچنے اور لڑھکنے لگتا تو عمراں کی نس نس دھڑکنے لگتی۔ اور وہ چاہتی کہ نیچے اندھیری گپھاؤں اور دور دھند میں ڈوبے ہوئے پربتوں پر تھرکتی اور گاتی پھرے لیکن وہ تنہا نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ کوئی باتیں کرنے والا بھی ہو جس کے گدگدیاں کرنے میں اسے کوئی جھجک نہ ہو اور وہ اسے چشموں میں دھکیل دے، بلندیوں سے لڑھکا دے، اٹھا کر درختوں کی آخر پھننگوں پر بٹھا دے۔ اس پر پھبتیاں کسے۔ اس کا مذاق اڑائے ــــ اور پھر گھٹائیں گھر آئیں۔ اونچی نگروں پر اور تنگ کھاڑیوں میں

ہوائیں فریادیں کریں۔ بجلی کی ناگنیں آسمانوں پر تڑپ تڑپ جائیں۔ ایک ایک بوند پاؤ پاؤ بھر کی ہو۔ اور وہ سب سے اونچی چوٹی پر سینہ تانے کھڑی ہو جائے اور اپنے ساتھی سے کہے "اللہ! یہ بارش کبھی نہ تھمے!" ——— لباسوں کی پھڑپھڑاہٹوں میں اس کا ساتھی کہے "ہاں یہ بارش کبھی نہ تھمے۔ برستی۔ برستی جائے۔ یہاں تک کہ آبادیوں پر سمندر چڑھ آئیں اور پربت کی صرف یہی چوٹی ان سمندروں میں ابھری کھڑی رہے ——— یہی چوٹی جس پر ہم دونوں کھڑے ہیں!"

دن گزرتے گئے اور عمراں کی سوچیں زیادہ شدید اور زیادہ گہری ہوتی گئیں اور آخر وہ دن بھی آپہنچا جب اسے رات کو حمد اور نعت گانے سے چڑ سی ہو گئی۔ وہ اپنی کھاٹ پر لیٹ جاتی اور چہرے کو چادر میں چھپا لیتی۔ ماں باپ اسے مجبور کرتے۔ "اری عمراں تجھے کیا ہو گا ہے۔ رسولؐ کی نعت نہیں گاتی؟ رسولؐ کی نعت نہیں گاتی کمبخت؟ وہی نعت سنا ذرا۔

مدینے دی بدلی! میرے اجڑے فصلاں تے رحمت دی بونداں وسانے دا وقت اے' عمراں کی ماں اسے اکسانے کے لیے گاگر بجا کر یہ نعت گاتی۔ لیکن عمراں کروٹیں بدلتی۔ انگڑائیاں لیتی اور خواب آلود آواز میں کہتی۔ "آج دیر ہو گئی ہے کل گائیں گے!" ——— اور پھر کل بھی اسی طرح گزر جاتا۔

اور خدا جانے کیا بات ہوئی کہ جس روز سے عمراں نے نعت گانا بند کی' آسمان پر بادل کا ایک ذرا سا ٹکڑا بھی نظر نہ آیا۔ کھیت زرد پڑ گئے۔ چٹانوں پر بھی خاک اڑنے لگی۔ درختوں بھیانک ٹنڈ منڈ آئے اور پھر ایسا دن بھی آیا کہ گاؤں کا تالاب خشک ہو گیا اور لوگوں نے مجبور ہو کر اس چشمے کا رخ کیا جہاں سے عمراں پانی بھرا کرتی تھی۔ عمراں کو اس کے ماں باپ نے کئی بار کوسا کہ اللہ میاں اس کی ضد سے ناراض ہو گئے ہیں اس لئے بارش نہیں برساتے' ورنہ اس سے قبل ہفتہ میں کم از کم دو بار ندی نالے بہ نکلتے تھے' مگر

عمراں نے ایک نہ مانی اور بولی۔ "اللہ میاں اگر صرف مجھ سے ناراض ہیں تو صرف میرے کھیتوں پر ہی بارش نہ برسائیں۔ ساری دنیا کو کیوں ترسا رہے ہیں!"

اور بوڑھا گرج کر کہتا۔ "بیوقوف۔ تو نہیں جانتی کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کر دیتی ہے۔ جانے کن سوچوں میں ڈوبی رہتی ہے ہر وقت۔ چند دنوں میں یہ چشمہ بھی سوکھ جائے گا۔ پھر پتہ چلے گا تجھے کہ خدا کا نام لینے میں کیا حکمت ہے بیوقوف چھوکری!"

ننھا شاہ محمد کئی مرتبہ اپنی بہن کے قریب آبیٹھتا اور ہولے سے کہتا۔ "عمرو۔ دیکھ۔ تو بڑی وہ ہے' نعت نہیں گاتی؟ رسولؐ کا نام نہیں لیتی؟ لے اب گا' ورنہ گال لال کر دوں گا طمانچوں سے!" ——— اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے' آنکھیں پھاڑے ہاتھ تان کر کہتا۔ "گا!"

عمراں نہایت مدھم آواز میں بے معنی سے بول گنگناتی۔ لیکن بارش نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔

گاؤں سے چشمے تک براہ راست کوئی پگڈنڈی نہیں جاتی تھی اس لئے سب لوگ عمراں کے آنگن کے قریب سے گزر کر چشمے پر جاتے اور جب پلٹتے تو ان کے ہاں ستانے بوڑھا گاؤں سے بہت سا تمباکو خرید لایا۔ لوگوں کو کھاٹوں پر بٹھاتا۔ حقہ پلاتا۔ عمراں اور شاہ محمد انہیں پنکھا جھلتے اور جب گاؤں والے اٹھتے تو راستے میں کہتے "بھئی یہ تو بڑے اللہ والے نکلے! انہیں گاؤں سے اتنی دور آباد ہوتا دیکھ کر ہم سب نے انہیں پاگل سمجھا' مگر ان کے دل کتنے صاف ہیں۔ ان کے بولوں میں کتنا رس ہے۔ سب کے سب کتنی خدمت کرتے ہیں ہماری! تمباکو۔ کھاٹیں۔ پنکھے! اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے لوگ بستے ہیں اور پھر بھی بارش نہیں ہوتی!"

دن بھر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا اور رات کو دم گھونٹ دینے والا حبس

پھیل جاتا۔ آسمان پر ستارے برص کے داغ بن جاتے۔ خاموش اندھیروں میں وحشتیں سنسناتیں اور لوگ پھٹے ہوئے ہونٹوں پر خشک زبانیں پھیر کر کروٹیں بدلتے۔ جمائیاں لیتے' اور صبح کو گدھوں' بیلوں اور اپنے سروں پر گاگریں لادے چشمے کا رخ کرتے۔

ان میں ایک نوجوان خان بیگ بھی تھا جسے لوگ بیگ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ آتے جاتے لوگوں کو بڑے دلدوز دوہے سناتا۔ بہاولپور میں وہ کافی عرصہ مزدوری کرتا رہا تھا اس لئے اسے خواجہ فرید کی بہت سی کافیاں یاد تھیں۔ جب بیگ گاؤں سے نکلتا تو لوگوں کا ایک اچھا خاصا مجمع اس کے ہمراہ ہو جاتا۔ دوشیزائیں بھی کالے تہمد باندھے اور سفید دوپٹے اوڑھے کھسر پھسر کرتی گھروں سے نکلتیں اور بیگ کے گانے سننے کے لئے پانی کا بہانہ گھڑ لیتیں۔ روڑے کی وجہ سے سب اُداس ہو گئے تھے اس لئے ان میں سے کئی کافیاں سن کر رو دیتے اور کہتے۔ "جیتا رہ بیگ۔ خواجہ فرید کی کافی اور بیگ کی آواز۔ سونے پر سہاگہ اسی کو تو کہتے ہیں!"

اور ایک روز جب بیگ عمراں کے آنگن میں ستا رہا تھا تو لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ بوڑھے میاں کو کچھ سنائے۔ اس نے خالی گاگر منگا کر انگلی میں ایک موٹا سا چھلا پہنا' خواجہ فرید کی کافی الاپی اور جب اس نے آخری بول گائے کہ ۔

سوہنیاں نال نبھاوے ہر کوئی
توں کو جھیاں نال نبھا!

تو عمراں کا بوڑھا باپ بلبلا اٹھا۔ لٹھ ٹیکتا بیگ کے پاس آیا اور بولا۔ "جیتا رہے بیٹے۔ تیری آواز میں شہد ہے!" بیگ مسکرانے لگا تو پکھا جھلتی ہوئی عمراں نے اس کے خشک ہونٹوں پر خون پھوٹتا دیکھا۔ بھوری پپڑیوں سے رستا ہوا خون اس کے باپ کی تائید کر رہا تھا۔

اس روز عمراں کو خلافِ معمول خوش خوش دیکھ کر بوڑھے نے کہا۔ "بیٹی۔ آج تو رسولؐ کی نعت ضرور گائے گی' ہے نا؟ آج تو اداس بھی نہیں اور گھر کا کام کاج بھی بڑے شوق سے کر رہی ہے!"

لیکن عمراں نے اسے ٹال دیا۔ اس رات اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ نعت بالکل نہیں گائے گی' کبھی نہیں گائے گی۔ اتنی رونق رہتی ہے اس کے گھر میں جلسہ سا لگا رہتا ہے! بارش ہو گئی تو یہاں چشمے پر کون آئے گا!

ـــــــــــوریر تک وہ مختلف بے بنیاد خیالات کے پھڑپھڑاتے ہوئے لبادوں میں گھری رہی اور جب سب گھر والے سو گئے' تو وہ باہر آنگن میں آ گئی۔ یونہی بے مطلب اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ باڑے کا کھٹکا اتار کر پھر لگا دیا۔ گاگروں کو گھما کر دیوار سے ٹکایا۔ جھاڑو کے تنکے جوڑتی رہی اور جب اندر جانے لگی تو اس کے کانوں میں اچانک کسی کے گانے کی بھنک پڑی۔ اسے بھیکڑ والی بھتنی کی داستانیں یاد تھیں جو روڑے کے دنوں میں زور زور سے گاتی ہے' سینہ کوٹتی ہے' بال نوچتی ہے' اور راہ چلتے کی گردن پر سوار ہو کر اس کا حلق اپنے گھٹنوں میں دبا کر چرمر کر ڈالتی ہے!

لیکن کچھ دیر بعد گانا بند ہو گیا۔ اسے کنکر لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ بھتنی کے ڈر کے مارے وہ دیوار سے چمٹتی گئی۔ اچانک ایک سایہ اس کے آنگن میں آ کر رک گیا۔ کاندھے پر سے گاگر اتار کر ایک طرف رکھ دی' باہیں تان کر ایک گہری سانس لی اور پھر باڑے کے ساتھ ساتھ ہولے ہولے ٹہلنے لگا' جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں ہے!

عمراں کو اس کی حرکات پر شبہ ہونے لگا۔ دیوار سے ہٹ کر بولی۔ "کون ہے رے!"

"حقہ ہو گا؟" گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"پر تو ہے کون؟" عمراں نے پوچھا۔

"بیگ۔" وہ بولا۔

اور عمراں کو یوں محسوس ہوا جیسے دنیا جہان کے ساز چیختے اور گونجتے ہوئے اچانک رک گئے ہیں اور ان کی گونج ہوا کے شانوں پر اوپر ہی اوپر ابھر کر ٹٹتی جا رہی ہے ــــ عمراں کا گلا رندھ سا گیا۔ ہتھیلیوں اور تلووں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ مڑ کر ایک طرف سے چلم اٹھا لائی اور بولی۔ "تمباکو ہو گا؟"

اور بیگ بولا۔ "تمباکو ہو گا پر دیا سلائیاں ختم ہو چکی ہیں۔"

"میں لاتی ہوں دیا سلائی۔"

عمراں ہولے ہولے قدم اٹھاتی اندر گئی۔ دیوار کے آگے ایک سرپوش کے نیچے اسے دیا سلائی کی ڈبیا مل گئی۔ پلٹتے ہوئے اس کا ہاتھ سرپوش سے ٹکرایا۔ بوڑھا کھڑکھڑاہٹ سے جاگ اٹھا اور خواب آلود آواز میں بولا۔

"کیا ہے؟ کون ہے!؟"

عمراں وہیں دبک گئی۔ چند لمحے تو وہ جیسے سانس لینے کے بغیر جی رہی ہے۔ دیا سلائی کی ڈبیا اس کے ہاتھوں میں دھڑکنے لگی۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا کہ اگر یہ دیا سلائیاں رگڑ کھا کر آپ ہی آپ بھڑک اٹھیں تو بڑا غضب ہو جائے گا۔ ایک بار جی ہی جی میں نعت پڑھنے کا خیال بھی آیا۔ لیکن اب بوڑھا کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔ "اف یہ کمبخت چوہے۔"

بہت مشکل سے عمراں نے ہنسی ضبط کی۔ اگر اس وقت اس کا باپ اسے چوہیا کیا چھچھوندر بھی کہہ دیتا تو وہ برا نہ مانتی کیونکہ نصف شب کو ایک نوجوان کے آگے چلم پیش کرنا اور تمباکو سلگانے کے لئے دیا سلائی ڈھونڈتے پھرنا ذرا بیہودہ سی بات ہے۔ باہر سے بیگ کی آواز آئی۔ "دیا سلائی مل گئی کیا؟"

اور عمراں بھڑک اٹھی! دہلیز سے ٹھوکر کھائی تو دیا سلائیاں بج اٹھیں۔

ہاتھ ٹیک کر اٹھ رہی تھی کہ بیگ بولا۔ "-- اوہ یہ کمبخت دہلیزیں ــــ دیا سلائی مل گئی؟"

عمراں گھبرا کر بولی۔ "دیکھو بیگ آہستہ بولو۔ ابا جاگ اٹھے تو ــــ"

"تو کیا؟" بیگ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے دیا سلائی کی ڈبیا آگے بڑھا دی۔ بیگ نے دیا سلائی جلا کر چلم سلگائی۔ تمباکو سے اٹھتی ہوئی لاٹ کی روشنی میں عمراں نے بیگ کو خوب اچھی طرح دیکھا اور وہ سوچنے لگی کہ اگرچہ اس کے ہونٹ پھٹے ہوئے ہیں' اس کی آنکھیں بے رونق ہیں' اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہے' لیکن وہ بھاؤنا ضرور ہے!

چند کش لگا کر بیگ نے دیا سلائی عمراں کو واپس دے دی۔ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا ــــ چلوں۔"

"پر تم چشمے پر اس وقت کیوں آئے؟" عمراں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

بیگ بولا۔ "کل مجھے بہت سے کام ہیں۔ اس لئے شاید چشمے پر نہ آ سکوں۔ پر تم کیوں پھر رہی تھی آنگن میں ــــ اتنی رات گئے؟"

"یونہی۔" عمراں کو چوٹ سی لگی۔

"یونہی؟ ــــ اس ویرانے میں ڈر نہیں لگتا؟ میں تو بھیکڑی کی بھتنی کے ڈر سے اونچا اونچا گاتا رہا۔"

"بھیکڑی کی بھتنی اپنے پڑوسیوں کو کچھ نہیں کہتی۔"

"پر میں تو اس کا پڑوسی نہیں۔"

"تم بھی پڑوسی ہو اس کے۔"

"کیسے؟"

"بس!"

بیگ ہنسنے لگا اور گاگر اٹھاتے ہوئے بولا۔" بابا کو سلام کہہ دینا' ورنہ کہہ دوں گا عمراں رات آنگن میں گھوم رہی تھی۔"

"جارے"——اور پھر نہایت محبت بھرے انداز میں بولی۔ "چغلخور!"

بیگ چلا گیا تو وہ دیر تک دیا سلائی کی ڈبیا اپنی انگلیوں میں گھماتی رہی۔ اور جب وہ دبے پاؤں مکان کے اندر جانے لگی تو دہلیز سے ٹکراتے بچی! بیگ نے ڈھلان اتر کر خواجہ فرید کی کافی الاپنا شروع کر دی تھی۔

عشق فرید النبی لائی

جل گیا مفت بچارا

جیسے کھنڈروں کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے سوراخوں سے ہوائیں چیختی ہوئی گزرتی ہیں' بس اسی طرح بیگ کے الاپے ہوئے یہ بول عمراں کے کانوں کے قریب بے حد تیز اور مسلسل سرسراہٹیں پیدا کرنے لگے۔ اندر کھاٹ پر بے جان کیلی کی طرح جا گری۔ کروٹ بدلی' باہیں اور ٹانگیں پھیلا دیں' گٹھڑی سی بن گئی' اندھیرے کمرے میں اسے اندھیرے سے بھی اندھیری پرچھائیاں ابھرتی دکھائی دیں۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور پھر اس کے سامنے ایک ناٹک سا ہونے لگا۔

اس نے دیکھا کہ دوپہر کا وقت ہے۔ آسمان بالکل صاف ہے۔ جھلسی ہوئی چٹانوں کی سطح بھاپ کی طرح کپکپا رہی ہے۔ آس پاس ٹنڈ منڈ درختوں پر کبڑے ٹہنوں کے سائے میں پرندے بیٹھے ہانپ رہے ہیں اور گاؤں سے ادھر ابھرتی ہوئی پگڈنڈی پر بیگ آ رہا ہے۔ کندھے پر پگڑی اور پگڑی پر گھڑا ہے اس کے بال کبھی کبھی ہوا میں لہرا کر اس کے ماتھے پر پھیل جاتے ہیں اور وہ انہیں جھٹکا کر پھر پیچھے ڈال دیتا ہے۔ اس کی نظریں عمراں کی ڈھوک پر جمی ہیں اور خود

عمراں ایک کانٹوں بھری جھاڑی کی آڑ میں بیٹھی بے دم ہو رہی ہے۔ بیگ خواجہ فرید کی کافی الاپتا ہے۔ کبڑے ٹہنوں پر پرندے اپنے پر پھیلاتے اور سمیٹتے ہیں۔ چٹانوں پر لرزتی ہوئی بھاپ ایک لمحہ کے لئے تھم جاتی ہے۔ اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سوکھی ہوئی پھلاہیوں میں ساز سے بجنے لگتے ہیں۔ بیگ اس کے قریب پہنچتا ہے تو وہ جھاڑی کی آڑ سے لپک کر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ تیورا کر پیچھے ہٹتا ہے اور گاگر اس کے کاندھے سے گر کر ڈھلان پر لڑھکتی بج بج بجتی' جگہ جگہ پر گلابی ٹھیکریاں بکھیرتی' اندھیرے کھڈ میں کھو جاتی ہے۔ بیگ گھبرا کر نیچے کھڈ میں دیکھتا ہے۔ عمراں زور زور سے ہنستی ہے اور پھر بیگ بھی اس ہنسی میں شامل ہو جاتا ہے!

بیگ عمراں کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور ڈھوک پر سے کسی ان دیکھی انجانی پگڈنڈی پر چلنے لگتا ہے۔ اچانک پگڈنڈی پر نرم نرم سبزہ بچھ جاتا ہے۔ آس پاس عجیب عجیب جھاڑیوں میں عجیب عجیب پھول کھل اٹھتے ہیں۔ پھلاہیوں اور صنوبروں کی ٹہنیاں پتوں کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔ پرندے چہچہاتے اور پھریریاں لیتے فضا میں گیندوں کی طرح لڑھکنے لگتے ہیں۔ پگڈنڈی اوپر ہی اوپر اٹھتی جاتی ہے۔ بیگ کی انگلیاں تپ جاتی ہیں۔ عمراں کی انگلیاں بھینچ جاتی ہیں۔ دونوں مسکرا رہے ہیں۔ بیگ کے بال اس کے کانوں پر اڑ رہے ہیں۔ عمراں کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر مخملی پگڈنڈی پر گھسٹتا آتا ہے اور بادلوں کی آڑ سے نکلتی ہوئی پیلی کرنوں میں اس کے بال سونے کے مہین تاروں کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔ اور جب یہ بال لہراتے ہیں تو یہ کرنیں ان پر قوس قزح سی چھڑک دیتی ہیں۔

دور' سب سے اونچے پربت کی سب سے اونچی چوٹی پر گاؤں کی مسجد کا سا مینار ابھر آیا ہے۔ وہ دونوں وہاں پہنچتے ہیں تو ہوائیں اور تیز ہو جاتی ہیں۔ ان کے کپڑے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہیں۔ بیگ مسکرا کر عمراں کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے

اور وہ گھبرا کر اس کے آغوش میں گر جاتی ہے۔ آسمان پر بادلوں کے پہاڑ سے امڈ آتے ہیں۔ تب کہیں دور سے گرج بھی سنائی دیتی ہے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگتیں ہیں۔ ہوا خنک ہو جاتی ہے۔ سورج کی کرنیں سمٹ کر ایک ڈراؤنے بادل میں چھپ جاتی ہیں اور چوٹی پر ابھرے ہوئے مینار کی آخری بلندی پر بیٹھ کر بیگ عمراں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے اور ایک کافی گاتا ہے۔ جس میں عمراں کے بالوں اور آنکھوں کا ذکر ہے۔

اور جب گرج تیز ہو جاتی ہے اور بوندیاں گھنی پڑنے لگتی ہیں تو وہ عمراں کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ہے۔ "عمراں۔ اب تیری باری ہے۔ مگر رسولؐ کی نعت سناؤ گی تو سنوں گا۔ بارش کھل کر نہیں پڑ رہی اور میں گھڑے اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہوں۔"

عمراں پوچھتی ہے۔ "مگر تم چشمے پر آنا تو نہ چھوڑ دو گے؟"

اور بیگ ہنس کر کہتا ہے۔ "بھولی۔ ارے اب پانی بھرنے آتا ہوں' پھر تمہیں دیکھنے آیا کروں گا۔"

"سچ؟" عمراں پوچھتی ہے'

"سچ" بیگ جواب دیتا ہے'

اور عمراں نقرئی تان اڑاتی ہے۔

مدینے دی بدلی ———

اچانک جھونکے طوفان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بادل زور سے کڑکتا ہے موسلا دھار بارش برسنے لگتی ہے۔ ہوا کی تیزی اور بارش کی شدت سے بیگ اور عمراں کے پاؤں اکھڑ اکھڑ جاتے ہیں۔ ایک زہرہ گداز کڑک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مینار جڑ سے اکھڑ کر نیچے کھڈوں کی طرف لڑھکنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بیگ اور عمراں بھی ——— عمراں بھی!

اس کی چیخ نکل جاتی ہے اور جب آنکھیں مل کر ادھر ادھر دیکھتی ہے

تو وہ اپنے مکان میں موجود ہے۔ دروازہ بند ہے۔ لیکن جھریوں سے صبح کی روشنی اندر چھن رہی ہے' اس کے والدین زور زور سے ہنس رہے ہیں اور اس کا شریر بھائی تالیاں بجا بجا کر ناچ رہا ہے' باہر بادل زور سے گرج رہے ہیں' کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی ہے۔ اور چھت پر اتنی تیز اور گنجان بوندیں پڑ رہی ہیں جیسے چھت ابھی چھلنی کی طرح ٹپکنے لگے گی۔

عمراں گھبرا گئی۔ گھوم کر کھاٹ سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کا باپ بولا۔ "اری تو اتنی گھبرا کیوں رہی ہے؟ تو نے ہمارے کہے سے رسولؐ کی نعت نہ گائی' پر جونہی تو نے نیند میں "مدینے دی بدلی" چھیڑی۔ ادھر پچھم سے ——— مدینہ پچھم ہی کی طرف تو ہے ——— ایک بدلی اٹھی۔ آن کی آن میں آسمان پر چھا گئی اور وہ بارش ہوئی ہے' وہ بارش ہوئی کہ شاہو کا مدرسہ ڈوبتا نظر آتا ہے!"

"اور منشی جی بھی!" شاہو بولا۔

"ہاں ہاں۔ وہ اللہ مارا بھی!" بڑھیا قہقہہ لگا کر بولی۔

مگر عمراں چیخ اٹھی۔ "میں نے نعت نہیں گائی!" ——— وہ ننگے پاؤں باہر دوڑ گئی۔ "خدا کی قسم میں نے نعت نہیں گائی۔ میں نعت کیوں گاتی ——— ارے پنگھٹ تو چھلک رہا ہے ——— اب کیا ہو گا!"

دیوانوں کی طرح اس کے ماں باپ باہر دوڑے۔ "دماغ چل گیا ہے۔" "کچی نیند میں تھی" ——— "ہولے ہولے جاؤ' گھر سے چھلانگ نہ لگا دے" ——— "وہ اس کا دوپٹہ اڑ گیا" ——— "چولے کے بٹن کھل گئے ہیں کمبخت کے" ——— "دیکھ نہ پائے تمہیں ورنہ کود جائے گی باڑ سے!" ——— "کلموہی!"

عقب سے بوڑھے نے چیختی ہوئی عمراں کو اپنے مرجھائے ہوئے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ چھپر سے اس کے کپڑے پھٹنے لگے۔ لیکن وہ اسے گھسیٹ

کر اندر لے گیا۔ شاہ محمد منہ میں انگلی ڈالے دہلیز کے پاس حیران کھڑا تھا، بڑھیا ایک میلی بوتل سے شہد نکال رہی تھی اور عمراں چلا رہی تھی۔ "میں نے نعت نہیں گائی۔ میں نعت کیوں گاتی!"

چیختے چیختے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور جب کچھ دیر کے بعد وہ اٹھی تو اس کا باپ اس کی کھاٹ کے قریب ہی ایک بہت بڑی آگ جلائے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے پاؤں کے تلوے مل رہی تھی اور شاہ محمد رونی صورت بنائے اپنے بالوں میں انگلیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھا تھا!

عمراں کو ہولے ہولے رات کا خواب اور اس کے بعد کے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ باہر صحن میں آئی تو دور پنگھٹ پر لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ بارش تھم چکی تھی۔ پہاڑ دھل کر اودے نکل آئے تھے۔ برساتی نالے چنگھاڑ رہے تھے اور بھیگے ہوئے پرندے کبڑے ٹہنوں پر بھولی ہوئی بولیاں الاپ رہے تھے!

وہ اچانک پلٹی۔ ایک پتھر اٹھا کر بڑی بڑی چٹانیں بجائیں کہ شاید بیگ کی گائی ہوئی کافیوں کی گونج، جو ان میں سما گئی تھی، باہر ابل پڑے، لیکن چٹانیں پھٹے پھٹے قہقہے لگا کر خاموش ہو گئیں۔ یکایک گاؤں میں ڈھول بجنے لگا اور پنگھٹ پر جھکے ہوئے سائے پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔

"کیا بات ہے ماں؟" عمراں نے اپنی خوفزدہ ماں سے پوچھا۔ جو اس کے چٹانیں بجانے پر حیران ہو رہی تھی۔

بڑھیا ہراساں لہجے میں بولی۔ "وہ گویا چھوکرا آیا کرتا ہے نا یہاں چشمے پر۔ اس کا بیاہ ہے"

اور عمراں نے آسمان کی طرف دیکھ کر زیر لب کہا۔ "واہ ری مدینے کی بدلی!"



جلسہ

غریب ہندوستان کے امیروں کا ایک غریب قصبے میں جلسہ ہونے والا تھا۔ دور دور سے بڑے بڑے مقرر آئے تھے۔ ڈھیلی ڈھالی عباؤں اور موٹے سیندوری تلکوں والے مقرر جن کے شدھ کھدر کے لباسوں سے عطر کی لپٹیں چھلکی پڑتی تھیں اور جن کی بھری بھری کلائیوں پر سنہری گھڑیاں بج رہی تھیں۔ انکی لچھے دار تقریریں سننے کے مشتاق دہقان جن کے جسم کے مسام مہین دھول میں اٹے رہتے تھے اور جن کی کلائیوں پر موٹے مٹیالے بال لپٹے رہتے تھے، قصبے میں آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ قصبہ شہروں سے بہت دور ایک گھنے جنگل کے کنارے پر تھا۔ اس کے مغرب کی طرف ایک برساتی نالہ تھا جس میں گاؤں کے بچے گول اور صاف چقمقاق کے گھروندے بنا کر لال بادشاہ سبز پری اور کالے دیو کا سوانگ بھرا کرتے تھے اور گاؤں کے مشرق کی طرف ایک بہت بڑا کھنڈر تھا جس کے متعلق قصبے میں یہ عجیب و غریب بات مشہور تھی کہ جب طوفان نوح آیا تو یہ محل آسمانوں سے ان لوگوں کے لئے اتارا گیا جنھوں نے غریبوں کے پیٹ بھرے اور مسکینوں کی دعائیں لیں۔ یہ محل طوفان کے دوران میں ہوا میں لٹکا رہا۔ اور جب طوفان ختم ہوا اور سمندر خشکیوں میں تبدیل ہو گئے اور خشکیاں سمندروں میں، تو اس محل کو چار فرشتے ہوا سے اتار

کر یہاں لے آئے کہ غریبوں کے پیٹ بھرنے والے اور مسکینوں کی دعائیں لینے والے اطمینان سے باہر نکل سکیں لیکن یہ دیکھ کر محل کو سہارا دینے والے فرشتے پتھر کی بے جان مورتیوں میں تبدیل ہو گئے کہ اس محل سے کوئی انسان باہر نہ آیا۔ صرف ایک بوڑھا سا کوا لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور اپنے ٹوٹے ہوئے پر پھڑپھڑاتا دور نیچی کچھی جھاڑیوں کے جھنڈوں میں غائب ہو گیا۔کہتے ہیں اس کوے نے صرف اس لئے ایک ننھے کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا نہیں چھینا تھا کہ اس ننھے کی معصوم آنکھوں میں تین دن کی بھوک نظر آتی تھی۔

باہر سے آئے ہوئے مقرروں نے اس محل کے پراسرار کھنڈر دیکھے تو حیران ہوتے رہے کہ لوگ اگلے وقتوں کی بے سمجھے بوجھے کیوں تعریفیں کرتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ نکلا کہ اس محل میں قدم دھرنے کا مجاز ہو سکتا۔ اور آج اس زمانہ میں ——— کہ یہ زمانہ سب زمانوں سے برا سمجھا جاتا ہے ——— ہم لوگ راتوں کی نیندیں اور دنوں کے آرام کو حرام کرکے تپتی دوپہروں میں سفر کرتے ہوئے اس قصبے میں آئے ہیں' صرف اس لئے کہ غریبوں کو جینے کا سلیقہ سمجھا سکیں اور مسکینوں کی دلجوئی اور داد رسی کریں ——— ان چار سفید مورتیوں کے پروں اور سروں پہ ہاتھ پھیرے گئے جنہوں نے اس محل کو طوفان کے دوران میں اپنے کندھے پر اٹھائے رکھا۔ ان میناروں پر آنسو بہائے گئے جو جھکی ہوئی چھتوں پر لیٹے جیسے دم توڑ رہے تھے۔ ان سیڑھیوں کو بہت احترام سے چھوا گیا جن پر ان دنوں کوئی انسان قدم نہ رکھ سکا۔

شام کے وقت ایک میدان میں گیسوں کی روشنی کی گئی۔ گاؤں والوں نے چندہ جمع کرکے گیسوں پھولوں اور ایسی ایسی چیزوں کا انتظام کر رکھا تھا جن کا انہوں نے کبھی نام تک نہ سنا تھا۔ بچے جوان اور بوڑھے اپنے دو گز پٹکوں کے

کنارے میں دو دو تنوری سوکھی روٹیاں پشاوری گڑ اور پیاز باندھے دور دور سے چل کر آئے اور اسکول کے ماسٹر جی نے برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی کے سفید گول پتھر اور بھورے اور گلابی چقمقاق چن کر میدان کے عین وسط میں ایک دائرہ بنایا جس کے اندر قدم دھرنا دہقانوں کے لئے قتل سے بڑا جرم تھا۔ اس دائرے میں بہت چوڑے اور اونچے تختوں پر ذیلدار رئیس خان' صوبیدار اللہ دین' پٹواری لیکھ چند' مسٹر عطا اختر بی۔ اے اور جمعدار انوپ سنگھ کے ہاں سے کرسیاں اور میزیں اکٹھی کرکے سجائی گئیں۔ علاقے میں سرسوں کے پھولوں کی کثرت تھی اس لئے جگہ جگہ چوبی دروازوں پر سرسوں کی پھول بھری ڈالیاں لپیٹی گئیں اور پنڈال کو سرسوں کے پھولوں کی زنجیریں پہنا کر جکڑا گیا۔ اس زعفران زار میں بیٹھے ہوئے ڈھیلی ڈھالی عباؤں اور موٹے سیندوری تلکوں والوں کی گردنوں میں چنبیلی کے ہار تھے جو شہر سے منگوائے گئے تھے اور گو وہ پیارے لال ڈرائیور اور نند لال کلینر کی نالائقی کی وجہ سے مسلے گئے تھے مگر آخر وہ چنبیلی کے ہار تھے اور شہروں سے منگوائے گئے تھے۔ سرسوں کے پھول خوبصورت سہی مگر ان میں چنبیلی کی سی بو باس کہاں' اور پھر چنبیلی کا عطر بنتا ہے اور سرسوں کا تیل ——— اور اس لئے مسلے ہوئے ہاروں سے ان کی گردنیں پٹی پڑی تھیں۔ پنڈال پر ان مہمانوں کے لئے دریاں بچھائی گئیں تاکہ ان کے جوتوں کے تلوے میلے نہ ہوں۔ اور میدان کے ہر طرف خاک کے بھورے قطعوں پر جفاکش دہقان لاٹھیاں زمین پر ٹکائے لمحہ لمحہ بھر بعد تھوک نگل کر کہتے تھے۔ "اے کب اٹھیں گے مولوی جی۔"

اور ادھر سے جواب آتا۔ "اے رہنے دو مولوی کو۔ وہ جو گیا باتا پہنے جو پنڈت جی بیٹھا ہے نا۔ وہ جس کے ہاتھ میں سنہری عصا ہے' راج کشور دکاندار کہہ رہا تھا کہ جب وہ گانے لگتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی لڑکی کے کنگن سے کانسی کا کٹورا ٹکرا گیا اور اسکی جھنجھناہٹ دیر تک کانوں میں گونجتی

رہی۔ آواز کی لہروں میں ایسی گٹکڑیاں چھوڑ تا ہے کہ معلوم ہو تا ہے کوئی زخمی ناگ بل کھائے تھرکا جارہا ہے۔ لے سن!"

دم بخود مجمع کی نظریں ایک بزرگ پر پڑیں جنھوں نے ایک ڈھیلی ڈھالی سبز عباپہن رکھی تھی۔ وہ آرام کرسی پر سے کھنکارتے ہوئے اٹھے۔ ان کے پھولے ہوئے گال گیس کی سفید روشنی میں دمک رہے تھے جیسے دہقانوں کے رخساروں کی ابھری ہوئی سانولی ہڈیوں کی پھبتی اڑا رہے ہیں۔ عربی زبان میں دو چار جملے گنگنا کر انہوں نے اپنی گونجیلی آواز کو بلند کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں اتنے لمبے کٹھن سفر طے کر کے آیا ہوں تو یہ سب تم بھائیوں کے بھلے کے لئے۔ مرحوم والد محترم کے عرس شریف کے تمام انتظامات اپنے چھوٹے بھائی کے سپرد کر کے صرف اس خاطر حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے دلوں پر سے مایوسیوں کے بھاری پردے اٹھا سکوں اور بتا سکوں کہ دعا میں کتنی قوت ہے۔ ذاتی طور پر میرا تو دعا میں اس قدر یقین ہے کہ ہل چلانا چھوڑ دو' کام کے پاس نہ پھٹکو' لمبی تانے پڑے رہو' مگر پانچ وقت نماز کے بعد اپنے خدائے علیم و بصیر کے حضور میں خشوع و خضوع سے سر رگڑنے کے بعد سچے دل سے گڑ گڑا کر دعا مانگو۔ رقتِ قلب سے روؤ اور کہو کہ اے پروردگارِ بے ہمتا اور اے آقائے جلیل و جمیل۔ ہم دکھیوں کی فریاد سن۔ ہم تیرے در کے کتے' تیرے دربار کے بھکاری' تیرے حضور سر بسجود ہیں۔ تو ہم پر اپنے بے پایاں انعام و اکرام کی بارش برسا۔ میں کہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں (اور یہاں انکی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھیں تر ہو گئیں) میں کہتا ہوں اس طرح تمہاری مصیبتیں چٹکی بجانے میں کافور ہو جائیں گی اور تم امن چین سے اپنی زندگیاں گزار کر بہشتوں میں جا بسو گے۔ دعا ایک ایسی زبردست قوت ہے' دعا ایک ایسا تیز ہتھیار ہے کہ اس سے عسرت کے دیو کو ہلاک کیا جا سکتا ہے اور عشرت کے دروازے وا کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن دعا میں اثر ہونا چاہیے۔ دعاؤں میں اثر پیدا کرنے کے لئے دل کی

صفائی ضروری ہے اور دل کی صفائی صرف بزرگوں اور چلہ کش درویشوں کے آستانوں پر جبہ سائی سے حاصل ہوتی ہے۔ مقبروں پر چڑھاوے چڑھاؤ۔ قربانیاں دو۔ مزاروں پر قوالی کرانے میں بڑا فیضان ہے۔ اس مبارک کام میں جی کھول کر حصہ لو۔ بزرگوں کی اولاد کی خدمت کرو۔ تم ایک دو گے تو اللہ تمہیں ستر دے گا۔ تمہارا قلب آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا اور تم پر کائنات کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ میرے مرحوم والد محترم کے حضور ایک بار بھوکا شخص آیا اور......" اور یوں حضرت مقرر اپنے والد کی قصیدہ گوئی میں کھو گئے۔ بیچارے دہقان سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند کر رہے تھے اور شدتِ جذبات سے مجبور ہو کر دعائیں مانگ رہے تھے' اور بہت پرے کانٹوں کی ایک باڑ کے اس طرف گاؤں کی عورتوں کا جمگھٹ یوں کھڑا تھا جیسے کسی مصور نے آسمان سے اتری ہوئی اور دھندلکوں میں لپٹی ہوئی حوروں کی ایک تصویر کھینچ دی ہے۔ گیس کی مدھم روشنیوں میں ان کے کنگن اور کنٹھے چمکتے تو لوگوں کی نظریں از خود ادھر اٹھ جاتیں اور وہیں گڑی رہ جاتیں اور پھر مولوی صاحب کی یہ آواز انہیں کنگنوں اور کنٹھوں اور ان کے ہمراہ کنگنوں اور کنٹھوں والیوں کی جنت سے اٹھا کر اس بھوری خاک پر پٹخ ڈالتی کہ "آخرت سے ڈرو۔ قیامت سے ڈرو۔ اور پیر کی بد دعا سے ڈرو۔ بزرگوں کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھاؤ۔ ان کی اولاد کی خدمت کرو۔ میں اسی لئے اتنے لمبے کٹھن سفر طے کر کے تمہارے پاس آیا ہوں!"

اور اس کے بعد ایک پنڈت جی اٹھے جن کی آواز میں واقعی ایک جادو سا تھا۔ سنہرے عصے کو کرسی کے ساتھ لٹکا کر اور گلے میں لپٹی ہوئی چادر کو ڈھیلا کر کے انہوں نے ایک لمبی اور دردناک گٹکری لگائی اور فرمایا۔

من کا دیا جلایا میت کے درشن کر کے
دو جگ میں گھوم آیا پیت سے من کو بھر کے

اور یونہی بیت اور میت' تن اور من' دکھ اور سکھ کا ایک جال بُن کر وہ خاموش ہو گئے اور تپتی دوپہروں میں ہل چلانے والوں اور دہکتی چٹانوں پر چڑھ کر باجرے کی فصلوں سے چڑیاں اڑانے والیوں کے دلوں کو دھڑکتا چھوڑ گئے۔ لیکن اچانک انہوں نے ایک اور رنگ بدلا اور پکارے۔ "مترو میں تمہارا ایک ادنیٰ داس تمہارے چرنوں میں صرف اس لئے آیا ہوں کہ میں ایک ایسے اناتھ آشرم کے لئے تم سے مدد مانگوں جس کی نیو میرے ہی ان پاپی ہاتھوں نے رکھی تھی' اور جس میں اس نگری کے اناتھ بالک ودیا کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ چرخہ کاتتے ہیں اور آگے جا کر جیون میں آنند اور سکھ پاتے ہیں۔ میرے جیون میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمان اور ہندو بھائی اپنے بھلے کی باتیں سوچنے کے لئے اکٹھے بیٹھے ہیں۔ میں اسے بھارت ماتا کے لئے ایک شبھ گھڑی سمجھتا ہوں اور آشا کرتا ہوں کہ میرے بھائی میرا ہاتھ بٹا کر اور پُن کر کے خورسند ہونگے۔ جلسہ گاہ کے باہر چند منش میرے جیسا جوگیا بانا پہنے اور جھولیاں بڑھائے کھڑے ہوں گے۔ جاتے ہوئے ان کی جھولیاں بھر دو کہ تمہیں جیون میں سکھ اور پرلوک میں شانتی ملے۔ رام رام۔"

"کیا کہا اس نے؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

اور ادھر سے جواب ملا۔ "پنڈت جی نے کہا کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں اور بہت جلد ہماری سرکار قحط سالی کی وجہ سے لگان معاف کر دے گی اور رام سب کا بھلا کرے!"

یہ بات سننے والے نہایت احترام سے پنڈت جی کو دیکھنے لگے جواب منہ میں پان اور انگلیوں میں سگرٹ رکھے ہوئے تھے اور گوپان کا پتہ سوکھ چکا تھا اور سگریٹ پر شیر کے سر کا نشان تھا مگر آخر وہ پان اور سگرٹ تھے اور انہی مقدس مہمانوں کے لئے شہروں سے منگائے گئے تھے۔

بہت لمبی لمبی تقریریں ہوئیں۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ نعرے لگائے گئے۔ اسمبلی کے ایک ممبر نے نہایت فخریہ انداز میں کہا کہ "مجھے دیکھو۔ میں تمہارا ایک ادنےٰ خادم سرکار عالی کے حضور تمہاری شکایتیں پہنچاتا ہوں اور تمہاری داد رسی ہوتی ہے۔ میں اپنا گھر بھول گیا۔ بال بچوں کا مجھے خیال تک نہیں۔ میری زمینیں پڑی برباد ہو رہی ہیں۔ لیکن آپ غریب بھائیوں کی خدمت کے لئے مجھے سب کچھ منظور ہے' اگر تم میرے چمڑے کی جوتیاں پہن کر چلنا چاہو' تو میرا چمڑا حاضر ہے' اور اب عنقریب نئے انتخابات آنے والے ہیں۔ کئی سرپھرے یہاں آکر میرا مقابلہ کریں گے' اور مجھے تم سے امید ہے کہ ——"

یونہی قسم قسم کی تقریریں ہوئیں' دہقانوں کے بھلے کی اسی طرح تجویزیں سوچی گئیں۔ دو دو دن کے ہل چلانے کو ملتوی کرنے والوں کو زندہ رہنے کا سلیقہ سمجھایا گیا اور اس دوران میں سگرٹ اڑائے گئے۔ پان چبائے گئے۔ شربت لنڈھائے گئے' اور چندے مانگے گئے۔ دہقان بھوری خاک پر آلتی پالتی مارے بیٹھے نہایت توجہ سے یہ باتیں سنتے رہے جو ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ جب اسمبلی کے ممبر صاحب اٹھے تو تمام جلسہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ "ہماری سڑک برباد پڑی ہے" "ہمارے لئے پانی کا انتظام نہیں۔" "ہماری فصلیں تباہ ہو گئیں مگر لگان معاف نہیں ہوا۔" "تھانیدار ہمیں بیگار پر پکڑ کر تنگ کرتا ہے!" لیکن ایک بوڑھے نے چپکے سے یہ نشتر سب کے دلوں میں چبھو دیا کہ "ملک بڑا آدمی ہے' اشارہ کر دے تو تم سب حوالات میں گلتے سڑتے نظر آؤ۔ رہنے دو اپنی سڑکوں' کنوؤں اور فصلوں کو۔ تقریریں سنو اور اللہ کی قدرت دیکھو!" ———— اور اچانک تمام مجمع پر موت کا سا سکوت چھا گیا۔

اس کے بعد ذیلدار رئیس خاں اٹھا۔ اس کا گز بھر لمبا کلف لگا طرا ہوا میں جھوم رہا تھا اور ریشمی ملبوس کی لہریں گیس کی روشنی میں کروٹیں بدل رہی تھیں۔ اس نے نہایت سنجے تلے الفاظ میں ایک ایسی ہستی کا تعارف کرایا جس کی

وجہ سے ذیلدار کے الفاظ میں یہ جاہل قصبہ آج بہشت بنا ہوا تھا۔ یہ صاحب گاڑی اور موٹر کار کے ذریعے ایک لمبا کٹھن سفر طے کر کے یہاں تشریف لائے تھے۔ چالیس پینتالیس کا سن۔ داڑھی اور مونچھوں میں اس قدر تیل پڑا ہوا کہ گیس کی روشنی میں ان کے بال چاندی کے تار معلوم ہوتے تھے۔ کھدر کا لباس اور سر پر گاندھی جی کی ٹوپی جسے خود گاندھی جی نے پہننا ترک کر دیا ہے! اٹھے اور جھک کر آداب بجالائے۔ اور فرمایا۔ "میرے خاک پر بیٹھے ہوئے بھائیو! میں تم سے بہت لمبی باتیں نہیں کروں گا۔ دو چار نکتے سمجھاؤں گا کہ انہی میں تمہارا بھلا ہے۔ پندرہ سال ہوئے میں تمہارے قصبے میں آیا تھا اور میری تقریر کے اثر سے تم سب نے ترکی اور گاندھی ٹوپی پہن لی تھی اور ہاتھوں میں سبز اور پیلے جھنڈے تھام لئے تھے۔ میں تین مہینے کے لئے جیل میں تمہاری خاطر چکی پیستا رہا اور تمہاری قربانیوں کی داستانیں سنتا رہا۔ آج میں تم سے نہیں بلکہ تمہاری ماؤں بہنوں بیویوں اور بیٹیوں سے مخاطب ہوں گا کہ سب سے پہلے ہمیں عورتوں کے سدھار کی ضرورت ہے۔ عورتیں ہماری آنے والی نسلوں کی امانتدار ہیں' ہمیں اپنی فلاح و بہبود سے بڑھ کر ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ ہماری اجڑی ہوئی محفلوں کی زینت اور ہمارے دکھے دلوں کا سہارا ہیں۔ وہ ہماری مجلسوں کا حسن اور ہمارے گھروں کی رونق ہیں (اور یہاں ان کی آواز بھرا گئی اور باڑ کے پرے کنگن اور کنٹھے جھلملانے لگے) اگر وہ پریشان اور فکر مند ہیں تو ہمارا آرام و اطمینان کس کام کا۔ پچھلے چند دنوں سے معدے کی شکایت کی وجہ سے میرے گلے پر بھی اثر پڑا ہے اس لئے میری آواز بہت جلد تھک جاتی ہے۔ شاید کانوں کی باڑ کے پرے میری آواز نہ پہنچ سکے۔ میں اپنی بہنوں سے گزارش کروں گا کہ اگر وہ باڑ کے اک طرف سے ہو کر جلسہ گاہ کے قریب آ جائیں تو مجھے بھی تکلیف نہ ہو گی' اور ان کا بھی بھلا ہو گا——— شہرت کے دو گھونٹ دیجیے گا!"

کنگن اور کڑے گیسوں کی سفید روشنی میں چمکنے لگے اور عورتیں ڈری ہوئی بھیڑوں کی طرح تتر بتر ہونے لگیں۔ دو چار ٹولیاں قصبے کی طرف چل دیں اور دو چار جلسہ گاہ کے قریب آ گئیں۔ لیکن آنے والیوں کی کلائیوں میں کنگن نہ تھے۔ یہ قصبے کی بڑی بوڑھیاں تھیں اور جانے والیاں وہ معصوم کنواریاں اور باحیا دلہنیں تھیں جو گیس کی سفید روشنی میں غیر مردوں کی نظروں کے چنگل میں گھر جانا شاید برا سمجھتی تھیں!

میرے قریب ہی ایک بہت بوڑھا شخص نسوار کی ڈبیا کو انگوٹھے سے بجاتے ہوئے بولا۔ "بچے۔ وہ مولبی کون ہے؟"

میں نے اسے مولوی جی کا نام بتایا تو اچانک اس کے فق چہرے پر وحشتیں برسنے لگیں۔ ہاتھ سے نسوار کی ڈبیا چھوٹ کر تہ بند پر گر گئی۔ نحیف آنکھوں کی پتلی جیسے کافور ہو گئی۔ ناک کی ہڈی اور ماتھے کے ابھار پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ اٹھا اور لڑکھڑا کر مجھ پر آن گرا۔ پھر اٹھا اور چیختا ہوا پنڈال کی طرف بڑھنے لگا۔ "ارے رستہ دو مجھے——— ہٹ جاؤ——— میرے سامنے سے ہٹ جاؤ——— جانے دو مجھے——— مجھے روکو نہیں۔ میں آج مدتوں کا بھولا ہوا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ گرتا پڑتا باہیں جھٹکاتا' آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ پگڑی کھل کر اسکی گردن میں اٹک گئی۔ پھٹا ہوا لباس پھڑ پھڑانے لگا۔ وحشیانہ انداز میں پنڈال پر نظریں گاڑے چلّائے جا رہا تھا۔ "مجھے رستہ دو۔ جانے دو مجھے!"

پہلے تو لوگ چپ چاپ اسے گھورتے رہے مگر جب سارے پنڈال نے ذیلدار کی طرف دیکھا جو بوڑھے کو قابو میں لانے کے احکام صادر کر رہا تھا تو سارا مجمع کھڑا ہو گیا۔ ذیلدار کا طرّہ گیس کے پاس لہرانے لگا اور مولوی جی کرسیوں کی آخری قطار تک پیچھے ہٹ گئے۔ ادھر سے دو کالے رنگ کے چوکیدار جھپٹے اور بوڑھے کو دبوچ کر مجمع سے باہر لے گئے۔ لوگوں کی افراتفری

سے اٹھا ہوا گرد و غبار دھندلے مرغولے بنکر گیسوں کے آس پاس منڈلانے لگا۔ لوگ ایک دوسرے سے اس بوڑھے کے متعلق پوچھنے لگے۔ میں نے بھی ایک شخص کو کاندھے سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "اے بھائی۔ یہ بوڑھا کون تھا!"

"خدا جانے!"

پیچھے سے ایک بوڑھے نے میری پیٹھ کو چھوتے ہوئے کہا۔ "لے میں بتاؤں بچے!"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے گاؤں کا بوڑھا دھوبی بیٹھا مسکرا رہا تھا اور لال مسوڑھوں کے پیچھے اس کی گول مول زبان پڑی کانپ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "اے بیٹا احمد' تو بھی خاک پہ بیٹھ گیا؟ وہاں کرسیوں پر تجھے کوئی جگہ نہ ملی؟ لی۔ آپاس اور دھول پہ بیٹھے۔ لے یہ چادر بچھا دوں!"

میں نے کہا۔ "بابا رہنے دو چادر کو۔ مجھے اس بوڑھے کے متعلق کچھ بتاؤ"

اس نے مجھے قریب کھسک آنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنے ڈھیلے ڈھالے ٹھنڈے بے رونق ہونٹ میرے کانوں کے قریب لا کر بولا۔ "لے سن۔ یہ بوڑھا ذیل دار رئیس خاں کا مزارعہ تھا۔ اس کی زمین پر ہل چلایا کرتا تھا۔ پندرہ سولہ سال گزرے یہی مولوی گاؤں میں آیا۔ اس کی خاطر مدارات کے لئے ذیلدار نے ہر گھر سے چندہ اکٹھا کیا۔ بوڑھا بے چارہ غریب آدمی چندہ ادا نہ کر سکا۔ ذیلدار نے اسے گھرکا اور کہا کہ وہ چندہ لئے بغیر چین نہ لے گا اور بچے! تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ اس نے بوڑھے سے چندہ لے لیا۔ وہ یوں کہ رات کو کسی وقت جب بوڑھے کی آنکھ کھلی تو اس کی اکلوتی جوان لڑکی کا بستر خالی پڑا تھا۔ وہ ذیلدار کے گھر کی طرف بھاگا۔ اور وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ذیلدار ایک کمرے کے باہر خود ہی ایک لٹھ تھامے بیٹھا ہے۔ ذیلدار کا اشارہ پاتے ہی ایک کتا ایک طرف سے جھپٹا اور بوڑھے سے چمٹ گیا۔ اسے کئی جگہ سے کاٹ

کاٹ کھایا لیکن بوڑھا آگے بڑھتا گیا اور ذیلدار سے جا کر پوچھا کہ میری لڑکی کہاں ہے' اور ذیلدار نے بتایا کہ وہ اندر مولوی جی کے پاس ہے اور تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ تیری لڑکی اپنا کنوارپن لٹا کر تیرا چندہ ادا کر رہی ہے! بوڑھے نے چیخنا چاہا مگر ذیلدار کی لٹھ سیدھی اس کے دماغ پر پڑی۔ چوکیدار اسے اٹھا کر باہر گلی میں لے آئے۔ اس دن سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ کسی سے بات نہیں کرتا۔ جو شخص ملے اسے پاگلوں کی طرح گھورتا اور نسوار کی چٹکی منہ میں رکھ کر آگے چل دیتا ہے۔"

"اور اس کی لڑکی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی سنو گے؟" بوڑھے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہتے ہیں وہ صبح کو مولوی کے چنگل سے نکل کر برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی میں بیٹھی رہی۔ لوگ اسے سمجھانے بجھانے آئے لیکن وہ وہیں پڑی رہی۔ اس کے بال کھلے تھے' چولا پھٹا ہوا تھا' اسے کوئی احساس نہ تھا کہ اس کا سینہ نظر آ رہا ہے اور کی پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ دو چار دن کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر کہیں چلی گئی۔ کہتے ہیں آج کل وہ لاہور کے چکلے میں بیٹھی ہے!"

گیسوں کی روشنیوں میں لپٹے ہوئے مولوی نے چنگھاڑ کر کہا۔ "میں اپنی بہنوں کو کس طرح سمجھاؤں کہ آنکھیں نیچی کر کے چلنے میں کتنا بڑا ثواب ہے۔ میں اپنی ماؤں کو ——!"

اور اچانک ایک کمزور سا بھولا بھٹکا کوا کھنڈر کی طرف سے رات کے اندھیرے میں پھڑپھڑاتا ہوا آیا اور مولوی جی کے سامنے ایک گیس سے ٹکرا کر نیچے گر گیا اور پنڈال کے تختوں تلے گھس کر چھپ گیا۔ بہت دور بوڑھے کی دبی دبی چیخ سنائی دی۔ "مجھے آج مدتوں کا بھولا ہوا فرض ادا کرنے دو!" —— اور تاروں بھرے آسمان کے مقابل ابھرے ہوئے آسمانی محل کے کھنڈر کانپے اور مجسمہ فرشتے جیسے اپنے سنگین پہ پھڑپھڑا کر اسی طرح سن ہو کر رہ گئے!

میرا دیس

میں جس دیس کی بات کرتا ہوں وہ اس دیس سے بالکل الگ ہے جہاں گاڑیاں چلتی ہیں اور موٹریں جھنجھناتی ہیں۔ جہاں ریشمی ساڑیاں سرسراتی ہیں اور باسی ہونٹ ہمیشہ لپ اسٹک کے محتاج رہتے ہیں۔ میں تو اس دیس کی باتیں کرتا ہوں جہاں چلنے کے لئے پاؤں استعمال کئے جاتے ہیں' اور سنگار کے لئے ارغوانی پھول۔ وہاں ایسی صاف سڑکیں بھی تو نہیں ہوتیں۔ پتلی پتلی پگڈنڈیاں کھیتوں میں لہراتی' ڈھیریوں پر لپکتی' ہرتی پھرتی' ہزاروں پاؤں کے مبہم نشانوں سے سجی ہوئی افق کے دھندلکوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ دراصل میں جس دیس کی باتیں کرتا ہوں وہ دیس تمہیں بھائے گا نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ یہ باتیں مجھے ضرور کہنی ہیں اور تمہیں ضرور سننی ہیں۔

وہ دیکھئے' وہ سامنے گاؤں کی تنگ گلی میں ایک چھوکری سر پر گھاس کا بہت بڑا گٹھا دھرے لڑکھڑاتی آ رہی ہے۔ یہ ایک کسان کی بیٹی ہے جس کی زمینیں قرق ہو چکی ہیں اور جو زمیندار کی ایک بیگھہ زمین کاشت کر کے اپنی بیوی بچی کا پیٹ پالتا ہے۔ چھوکری جوان ہے۔ چہرے پر سرخی ہے' مگر بے رونق سی' جیسے اینٹ جو دھوپ میں پڑے پڑے تپ گئی ہو۔ اس کے بالوں میں

بھی ملائمت ہے لیکن بجھتے ہوئے انگاروں پر ابھری ہوئی راکھ کی طرح۔ اس کی چال میں بھی لچک ہے لیکن ٹوٹی ہوئی ٹہنی کے آخری مایوسانہ ہلکورے جیسی۔ یہ گھاس کا گٹھا جو اس کے سر پر ہے اس کی سپید گردن کی رگوں کو خیمے کی طنابوں کی طرح کھینچے ہوئے ہے۔ پاؤں میں جوتا ہے جس کے تلے میں سوراخوں کی وجہ سے چیتھڑے دبا رکھے ہیں اور ایک چیتھڑا سوراخ سے باہر نکل کر میلی گلی میں ایک آڑی ترچھی لکیر بناتا گھسٹتا آتا ہے۔ جیسے بیچاری اپنی تقدیر آپ ہی لکھے جا رہی ہے!——ٹیڑھی بینگی سی لکیر' تنکوں میں لہراتی' کانٹوں میں الجھتی' کوڑے کے ڈھیر میں سے ہوتی دھول کی گہرائیوں میں زخمی سانپ کی طرح دوڑی جا رہی ہے۔

اس بیچاری کو گھر جا کر بہت سے کام کرنا ہیں۔ پہلے تو گھاس کا گٹھا زمیندار کے چھپر تک پہنچایا جائے گا جہاں زمیندار کے ڈھور ڈنگر منہ اٹھائے اس کے منتظر ہوں گے۔ واپس آ کر یہ گھر کے صحن میں جھاڑو دے گی۔ اس کے لمبے گھنگریالے بال جو اس کی پیٹھ پر کالے بادل کی طرح پڑے ہیں' مٹیالے ہو جائیں گے' اس کی جذبات بھری پلکیں جن کا تناؤ کلیجوں پر نیزے کی انی کی طرح پڑتا ہے' دھول سے اٹ جائیں گے۔ اس کا پھٹا ہوا دوپٹہ جس کے ایک کونے میں اس نے شاید گڑیا پیاز باندھ رکھی ہے' ڈھلک کر ایک طرف گر جائے گا اور اس کی ماں پکارے گی۔ "اری سر پہ دوپٹہ اوڑھ لے۔ کنواری لڑکیاں ننگے سر نہیں پھرا کرتیں' ورنہ ننگی آسمان ٹوٹ پڑتا ہے" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرائے گی۔ ایسی مسکراہٹ جیسے زندگی سے مایوس انسان کی جسے طبیب لاعلاج کہہ کر چھوڑ گئے ہوں' ایک سمجھے بوجھنے والے کی مسکراہٹ جسے سمجھ بوجھ کے ابتدائی اصول سمجھائے جا رہے ہوں——نہایت تلخ اور نکیلی مسکراہٹ' جس کی تلخی اور جس کی نوک خود اس کی روح محسوس کرتی ہے——وہ مسکرا کر دوپٹہ سر پر ڈال لے گی اور یونہی جھاڑو پھیرتی جائے گی۔

بوڑھے بیلوں کا گوبر اٹھا کر چھت کی منڈیر پر تھوپے ہوئے اپلوں کی قطار سجائے گی۔ نیچے آ کر بیلوں کے آگے خشک جوار کے آٹھ دس ٹانڈے پھینکے گی اور سر پر دو گاگریں اور کولھے پر ایک گاگر رکھ کر کنویں پر جائے گی اور راستے میں سوچے گی۔

"اری تو کس ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی کہ تجھے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ کس گناہ کی پاداش میں تجھے دنیا کے اس دوزخ میں جھونکا جا رہا ہے۔ پرسوں مولوی وعظ میں کہہ رہا تھا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ اگر سب انسان بھائی بھائی ہیں تو زمیندار میرے باپ کو گھرکتا کیوں ہے' میرا باپ زمیندار کو کیوں نہیں گھرک سکتا۔ میرا باپ اسے اپنے گھر بلا کر اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر یہ کیوں نہیں کہتا۔" آج میری طبیعت کچھ ناساز سی ہے۔ جنگل میں جا کر خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا لا دے۔ اور دیکھو لکڑیاں پرانے مردے کی ہڈیوں کی طرح خشک ہوں۔ اگر ذرا بھی گیلی ہوئیں تو سمجھو تیری قسمت پھوٹی"

——— آخر یہی الفاظ تو ہیں جو زمیندار میرے ابا کو کہا کرتا ہے۔ اور پھر اگر سب انسان بھائی بھائی ہیں' تو میں زمیندار کی بیٹی کو یہ کیوں نہیں کہہ سکتی۔ "اری ہاتھوں میں مہندی پھر رچائیو۔ اور آنکھوں میں کاجل بھی بعد ہی میں لگا لیجو۔ یوں کرو کہ یہ تین گاگریں اٹھالو اور لپک کر کنویں سے ٹھنڈا پانی بھر لاؤ۔ میں نہاؤں گی۔ اور دیکھو اگر کوئی گاگر رستے میں ٹوٹی تو سمجھو تمہاری قسمت پھوٹی۔"

جاتے جاتے ہنس پڑے گی اور سوچے گی۔ "بھئی بہت لطف آئے۔ بڑا مزہ آئے۔ وہ باہر نکلے تو لڑکے اسے چھیڑیں اور اس کے عجیب عجیب نام رکھیں۔ "گلہری' دھڑ کالا دم سنہری!" چھپکلی نازوں سے پلی"! "مسی بلی' چہرے پہ مونچھیں آنکھوں میں جھلی!" پھر کوئی ادھر سے کنکر اٹھا کر "ٹناک" سے گاگر پر پھینک دے! اور پھر لطف آ جائے' اس کے رونے کا' بھگ جائے۔ ٹوٹی

ہوئی گاگر کے سامنے گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ جائے اور بسورنے لگے۔ اتنی روئے کہ اس کی ناک پکی مرچ کی طرح لال پڑ جائے' گال شلغم کی طرح ابھر آئیں اور آنکھیں گاگر کی ٹھیکریاں بن جائیں۔ واپس آئے تو میں برس پڑوں۔ "اری مونڈی کاٹی! اے کنوار پنے میں چھوکروں سے گاگروں کو نشانہ بنواتی پھرتی ہے۔ اے تیرے لیکھ کہیں نہ جاگیں' کیا یونہی پانی بھرا جاتا ہے۔ اگر روز ایک گاگر ٹوٹی تو سمجھو تمہاری قسمت پھوٹی!"

وہ مسکرائے گی ——— وہ مسکراہٹ جو اس کا خاصہ بن چکی ہے۔ واپس آ کر گیلے ٹانڈوں میں پڑوس سے لائے ہوئے انگارے رکھ کر پھونکیں مارے گی اور اتنی دیر تک پھونکیں مارے گی کہ سائے ڈھل جائیں گے۔ اس کا سینہ ابھرے گا۔ اور بیٹھ جائے گا۔ اس کے گلابی نتھنے لرزنے اور اس کے گال تمتمانے لگیں گے۔ اس کی آنکھیں راکھ اور دھوئیں اور تھکن سے پتھرا سی جائیں گی! اور باجرے کی دو موٹی موٹی روٹیاں پکا کر اور چھاچھ کا ایک پیالہ بھر کر بوڑھی ماں کے آگے رکھ دے گی۔ چھاچھ کے برتن پر موٹی روٹی رکھ کر اور اپنی پھٹی چادر سے ڈھانپ کر باہر کھیتوں میں اپنے باپ کے پاس چل دے گی' جو اسے دیکھ کر کہے گا۔ "آ گئی میری بچی۔ بچی' آج کتنی دھوپ ہے۔ آج تو جیسے زمین کے نیچے تنور سلگ رہے ہیں۔ اور بچی' تیرے جوتوں کے چیتھڑے تو شاید رستے ہی میں گر گئے۔ کوئی اور چیتھڑا ڈال لے' لے یہ میری پھٹی ہوئی پگڑی کا پلو۔ لے' اور بچی۔ آج تو نے منہ کیوں نہیں دھویا۔ دیکھ تو گرد سے تیرا سارا چہرہ اٹ رہا ہے۔ تو ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے بچی۔ تو کھوئی کھوئی نہ رہا کر۔ میں بوڑھا تیرے سہارے ہی تو جی رہا ہوں۔ تیرے بل پر تو میں اس دوزخ میں اڑا پھرتا ہوں۔ ورنہ میری بچی میرے پاؤں کے تلوے تو کب کے قبر کی سردی کو چھو رہے ہیں!" ——— اور وہ کہے گی۔ "ابا دراصل مجھے بھیا بہت یاد آتے ہیں۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو آج بڑے بانکے جوان ہوتے۔ ہیں نا

ابا؟ سوچتی ہوں نہ ریل بجتی نہ وہ پہیوں کے نیچے آتے۔ اور ابا کیا بھیا پھر واپس نہ آئیں گے۔"

اور اس کا ابا کہے گا۔ "اری' اگر مرنے والے واپس آسکتے تو خدا کو کون مانتا۔" ـــــــ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھے گی۔ صرف اس لئے کہ وہ ان باتوں تلے اپنی وہ آگ چھپائے گی جو اس کے جوان سینے میں دہک رہی ہے۔ وہ سلگتی ہوئی بھٹی جس کی لپٹیں اسے اپنی لپیٹ میں لے کر انگارہ بنا ڈالتی ہیں۔ اور وہ اکثر سوچا کرتی ہے کہ "کئی لکڑیوں کے انگارے پڑے پڑے راکھ بن جاتے ہیں۔ اور کئی لکڑیوں کے انگارے پڑے پڑے پھوٹ پڑتے ہیں اور آس پاس بیٹھنے والوں کے ریشمی لباسوں میں کالے کالے سوراخ ڈال دیتے ہیں ـــــــ انگارے کبھی کبھی پھوٹ بھی پڑتے ہیں!" ـــــــ انگاروں کے پھوٹنے کا خیال اس کا بہت بڑا سہارا ہے' وہ سوچا کرتی ہے کہ جس طرح پل پل اور گھڑی گھڑی اس کی قسمت پھوٹتی ہے' اسی طرح کبھی ـــــــ ایک بار ـــــــ صرف ایک بار یہ کنوارا انگارہ پھوٹے تو کیا لطف آئے۔ سوراخ ڈالدے آس پاس بیٹھنے والوں کے ریشمی لباسوں میں اور پھر چاہے ننھی چنگاریاں بن کر ان کے جوتوں تلے مسلا جائے۔

خالی برتن اٹھا کر واپس گھر آئے گی۔ ماں کی میٹھی جھاڑ کے بعد وہ درانتی اور رسی اٹھا کر پھر جنگل کا رستہ لے گی بہت دیر تک تنکا تنکا گھاس کاٹتی پھرے گی۔ اور جب شفق مغربی پربتوں پر گلاب کے پھول بکھیر دے گی اور جب قدرت کا ہاتھ اندھیرے آسمان پر سنہری خاک چھڑک دیگا تو وہ اپنی قسمت کی سی آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر تیز تیز قدم اٹھاتی گھر آئے گی۔ اس کا بوڑھا باپ گیلے ناٹڈوں میں پھونکیں مار مار کر روٹیاں پکا رہا ہو گا۔ دو لقمے زہر مار کر کے اٹھے گی تو اس کی ماں کہے گی۔ "اری جلدی جلدی لوٹا کر۔ تو تو جہاں جاتی ہے وہیں کی ہو رہتی ہے۔ کنواری لڑکیاں راتوں کو بہت دیر تک باہر نہیں رہا کرتیں' بچی۔

آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔" اور اس کا باپ کہے گا۔ "ہاں میری بچی جلدی آجایا کر۔ لیکن آخر تو کیسے جلدی واپس آئے گی' کوت بھی تو تو ہی کرتی ہے اور بھوسہ بھی تو ہی چھانتی ہے۔ راستہ دیکھ کر چلا کر بیٹی۔ سانپ بچھو کی رت ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے گی اور سر پر گٹھا رکھ کر زمیندار کی ڈیوڑھی کا رخ کرے گی اور جب چاند پربت کے کسی غار سے ابھرے گا' اور سانپ سسائیں گے' جب ٹھنڈی ہوا بوڑھے درختوں میں خوفناک گیت گائے گی اور بچھو اپنے ڈنک تولے پگڈنڈیوں پر بیٹھ جائیں گے' تو یہ واپس آئے گی۔ پریشان بال' سرخ گال' بھیگی پلکیں' ڈھلکا دوپٹہ' مسکا چولا' گرم سینہ' ٹھنڈی انگلیاں اور ڈھیلی باہیں۔ آنکھوں میں سلگتی رت اور سینے میں گرجتی بجلیاں۔ قدم قدم پر یہ باتیں اس کے کانوں میں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح گھسیں گی اور اس کی چال میں میگسارانہ شان پیدا کر دیں گی۔

آگئی تو؟ آج پھر تو نے منہ ہاتھ نہیں دھوئے! اری میرا کہا مان لے۔ بن ٹھن کر رہا کر اور گھاس کاٹنے کے لئے اس بوڑھے نچر کو بھیج دیا کر۔ ابھی خاصہ تگڑا ہے اور اس بڑھیا کو کھاٹ سے کھینچ کر چولھے کے قریب بٹھا دیا کر' تاکہ اپنا کھانا خود پکا لے اور تو شام ہوتے ہی ادھر آجایا کر۔ اری تو تو اپنی جوانی برباد کر رہی ہے۔ تو تو شراب کو گھورے پر ڈال رہی ہے بچی۔ تو تو سونے کی ڈلیاں دلدل میں پھینکے جا رہی ہے دیوانی! اری بھولی۔ تیری یہ کافر جوانی' اور پھر یہ اپلے اور گیلے ناٹڈے اور کھردری گھاس اور ـــــــ یہ ـــــــ یہ پھٹے ہوئے جوتے' اور یہ چولا ـــــــ دیکھ تو تیری چھاتیاں اور تیرا پیٹ اور تیری باہیں ـــــــ سب کچھ تو نظر آ رہا ہے ـــــــ اس سے بہتر ہے کہ کپڑے اتار کر ننگی چلا پھرا کر۔ تف ہے! میں کہتا ہوں تو مجھ سے ریشم کے انبار لے۔ سونے کے زیور لے۔ مخملی جوتے لے۔ جو کچھ تو چاہتی ہے میں تجھے لا دوں گا۔ پر خدا کے لئے اپنی حالت سنبھال۔ تو نئی نئی کلی ہے اور اپنے ہی بوجھ سے زمین کی

طرف جھکی جا رہی ہے۔ زمین گرم ہے اور تو جھلس جائے گی۔ پھر مجھ پر الزام نہ دھریو۔"

اور پھر اس کی اپنی آواز۔ "زمیندار جی۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ ——— آپ میری جوانی چاہتے ہیں نا۔ لے لیجئے میری جوانی اور مجھے رخصت کیجئے کہ میرے بوڑھے ماں باپ پڑے کراہ رہے ہوں گے۔ آپکی یہ مہربانی کیا کم ہے کہ شام کی اس ذرا سی روحانی اور جسمانی محنت کا صلہ آپ یوں دے رہے ہیں کہ میرے بوڑھے باپ کو ایک بیگھ زمین کاشت کے لئے دے رکھی ہے۔ جلدی کیجئے مجھے جانا ہے۔"

"اری تو تو پگلی ہے۔ دیوانی۔ پھول اور کڑوی خوشبوئیں پھیلائے۔ پگلی! اور تیرا یہ جسم کیوں جل رہا ہے؟" اور پھر اس کے گالوں پر انگلیاں کھیلنے لگیں گی۔ اس کی باہوں پر ہاتھ پھرنے لگیں گے جیسے سانپ ڈسنے کے لئے کوئی نرم جگہ تلاش کر رہے ہیں اور اس کے بعد اس کا دل قیامت خیز رفتار سے دھڑکے گا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے گھر آئے گی اور کھاٹ پر بے جان لوتھڑے کی طرح گر جائے گی۔ اس کے ماں باپ پوچھیں گے۔ "اتنی دیر کیوں لگا دی تو نے؟"

اور وہ کہے گی۔ "زمیندار کے مہمان آ گئے تھے۔ گھوڑوں کے آگے چارہ ڈالنا پڑ گیا۔"

اور اچانک اسے اپنا سارا وجود ایک انگارے کی شکل اختیار کرتا محسوس ہو گا اور وہ سوچے گی کہ یہ انگارہ کب پھوٹے گا۔ کب پھوٹے گا یہ انگارہ کہ میں چنگاریاں بن کر ان زمینداروں' ان مولویوں اور پیروں کے ریشمی ملبوس میں کالے کالے سوراخ ڈال دوں۔ ان کے دیدوں میں گھس جاؤں' ان کی کنپٹیوں سے چمٹ جاؤں! صبح تک یہ انگارہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ وہ پھر اٹھے گی۔ وہی گھاس کا گٹھا ہو گا' اور وہی جوتوں کے چیتھڑوں کی آڑی

سیدھی لکیر ——— وہی پھٹا ہوا چولا اور وہی جھلکتی ہوئی چھاتیاں!

یہ انگارہ یوں ہی تپے گا۔ ٹھنڈا ہو گا۔ تپے گا۔ ٹھنڈا ہو گا اور زمیندار کے شبستان میں اسی طرح ——— تم انگڑائیاں لے رہے ہو' شاید تھک گئے ہو یہ متعفن باتیں سن کر! اچھا ——— !

☆

جوانی کا جنازہ

گاؤں کے پچھم کی طرف پہاڑیوں کی ابھرتی اور پھیلتی ہوئی قطاروں کی دھندلی چوٹیوں پہ وہ بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔طلوع آفتاب کے ساتھ ہی وہ تنگ اور ٹیڑھی گلیوں میں سے بھیڑیں ہنکائے نکلتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بنسری ہوتی اور دوسرے میں ایک پوٹلی' جس میں گذشتہ شام کی دو روٹیاں اور ایک موٹی سی پیاز ہوتی۔ پتلی پتلی پتھریلی پگڈنڈیوں پر زیر لب گنگناتا' سست رفتار بھیڑوں کو ایک قطار میں چلنے کے لئے احکام صادر کرتا' وہ اوپر ہی اوپر چڑھتا جاتا اور جب مشرقی افق پر سورج نیزہ بھر بلند ہو جاتا اور بہت دور نیچے گاؤں کی چھتوں پر بہت دیر تک سونے والے کبرو کروٹیں بدل کر اٹھ بیٹھتے' تو وہ ایک خاص چوٹی پر پہنچ جاتا۔ بھیڑیں ادھر ادھر بکھر جاتیں اور وہ لانبی گھاس کے لہراتے اور جھومتے ہوئے پودوں میں ایک پتھر اور اپنی پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتا اور بنسری سے ایسے ایسے سریلے سُر نکالتا کہ بہت پرے ڈھلانوں پر بکھرے ہوئے جھونپڑوں کے دالانوں میں رنگ برنگی اوڑھنیاں پھڑپھڑانے لگتیں اور رسیلی تانیں دیر تک نشیب و فراز میں گھومتی رہتیں۔ نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے بادل تھم جاتے اور سورج کی تیز شعاعیں تھرتھر لرزتی موسیقی کے نشے میں جیسے لڑکھڑانے لگتیں۔

دوپہر کو وہ نیچے ایک جھرنے پر چلا جاتا۔ باسی روٹیوں اور پیاز کو جھرنے

کے شفاف پانی کی مدد سے حلق کے نیچے اتارتا۔ بھیڑیں دھوپ سے گھبرا کر آس پاس جھاڑیوں کے تلے جمع ہو کر چھدری چھاؤں کی پناہ لینے لگتیں اور وہ وہیں جھرنے کے کنارے ایک سفید' ٹھنڈی اور چوڑی چٹان پر لیٹ جاتا اور بہت دیر تک سویا رہتا۔ یہ جھرنا ایک گہری کھاڑی میں تھا۔ اس لئے یہاں دھوپ بہت کم آتی۔ شام سے چند لمحے پہلے اٹھتا۔ اور پھر وہیں منہ ہاتھ دھو کر بنسری سنبھالتا اور بھیڑیں ہنکائے واپس گاؤں آ جاتا۔

یہی اس کا معمول تھا اور یہی اس کی زندگی۔ اس کی مثال بالکل اس دربان ایسی تھی جو ایک طویل و عریض محل کی ایک بہت لمبی غلام گردش میں صبح سے شام تک ٹہلتا رہتا ہو اور پھر اپنے گھر جا کر صبح کے انتظار میں سو رہتا ہو۔

اور پھر ایک روز کا ذکر ہے کہ اس غلام گردش کی دونوں طرف کی سنگین دیواروں میں دو چار ننھی ننھی کھڑکیاں سی پیدا ہو گئیں۔ بھیڑیں آگے لگائے جب پنگھٹ کے قریب سے گذرا جو اس کی راہ میں پڑتا تھا تو اسے وہاں ایک لڑکی دو بھری ہوئی گاگریں سامنے رکھے حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھتی نظر آئی۔ روزانہ سینکڑوں لڑکیاں اسے پنگھٹ پر نظر آتی تھیں اور اس کے خیال میں ان لڑکیوں کا مصرف صرف یہ تھا کہ پانی بھریں' روٹیاں پکائیں' باہر کھیتوں میں اپنے بھائیوں کو کھانا پہنچا آئیں' باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑنے کیلئے دن دن بھر کھڑی دھوپ میں سڑتی رہیں اور پھر جب ان کے والدین کے پاس کچھ رقم اکٹھی ہو جائے یا مہربان مہاجن قرضہ دینے پر رضا مندی ظاہر کرے تو ان کا بیاہ ہو جائے اور وہ کسی اور گھر میں جا کر اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہو جائیں! اس نے سوچا' شاید یہ لڑکی اپنی کسی سہیلی کے انتظار میں کھڑی ہے اور سہیلی شاید ابھی تک دودھ بلو رہی ہو گی۔ یا دہی دیر میں جما ہو گا۔ یا شاید وہ بکریاں دوہ رہی ہو گی۔ کیونکہ بکریاں باہر جانے سے بس ایک دو لمحے پیشتر ہی دوہی جاتی ہیں تا کہ دودھ کا ایک حقیر سا قطرہ بھی ان کے تھنوں

میں نہ رہنے پائے۔ اسی لئے صبح کو گھروں سے نکلی ہوئی بکریوں کے تھن پرانے چیتھڑوں کی طرح لٹکتے نظر آتے ہیں! یہی باتیں سوچتا جا رہا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی۔ "اے بھائی۔ ذرا یہ دو گاگریں تو رکھ دے میرے سر پر!"

اس نے سوچا۔ یہ عجیب لڑکی ہے کہ دو گاگریں زمین سے اٹھا کر سر پر نہیں رکھ سکتی۔ پہلے ایک گاگر سر پر دھر لے۔ پھر جھک کر دوسری کو کولھے پر ٹکائے' اور گھر چلی جائے۔ آگے رستے میں کھیت پڑتے ہیں۔ بھیڑوں نے ادھر کا رخ کر لیا تو فساد ہو جائے گا کھیتوں کے رکھوالے سے۔ پچھلے دنوں بھی وہ گلیوں میں بڑبڑاتا پھرتا تھا کہ غونث ہر اس کھیت میں بھیڑیں ہانک دیتا ہے جو پگڈنڈی کے آس پاس لہلہا رہے ہوں!

"ارے بھائی سنتے ہو؟ یہ دو گاگریں ———!"

اور غونث پلٹ کر بولا۔ "اچھا اچھا۔"

آگے بڑھ کر اس نے ایک گاگر اٹھائی اور اس کے سر پر دھر دی۔ بوجھ کی وجہ سے اس کی گردن کی رگیں تن گئیں اور گالوں پر ہلکا گلابی پسینہ پھوٹ نکلا۔ "بڑی کمزور چھوکری ہے۔" اس نے سوچا۔ "اس عمر کی لڑکیوں کو میں نے تین تین گاگریں اٹھا کر گھوڑی کی طرح دوڑتے دیکھا ہے۔ اس کے سر پر دوسری گاگر رکھ دی گئی تو بیٹھ جائے گی بزدل اونٹنی کی طرح!"

مسکرا کر بولا۔ "پہلی گاگر ہی نے تیرے ہوش اڑا دیئے ہیں۔ اب اس دوسری گاگر سے تیرا دم ہی نہ نکل جائے۔"

اور وہ شرما کر بولی۔ "میں بیمار ہوں بھئی۔ مجھے دس روز سے بخار آتا ہے' پر اٹھالے جاؤں گی۔ لے اب اٹھا دوسری گاگر۔ وہ دیکھ تیری بھیڑیں عطا کے کھیتوں میں گھس گئی ہیں!"

بھیڑیں سر سبز کھیتوں میں گھس کر مزے سے چر رہی تھیں اور پرلی طرف پہاڑی پر سے خوفناک گالیوں کا ایک گرجتا ہوا سیلاب امڈ رہا تھا! گھبراہٹ

میں غونث نے گاگر پکڑ کر اوپر اٹھائی تو گاگر کی چکنی سطح پر اس کی انگلیاں نہ جم سکیں۔ وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر لڑکی کے پاؤں پر جا گری اور خون کی ایک پتلی سی دھار اس کے انگوٹھے سے نکل کر پنگھٹ کے پانی میں گھلنے لگی!

"واہ رے گبرو۔" وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "تو تو غلاموں کمہار سے بھی زیادہ نالائق نکلا۔ گاگر بھی توڑ دی' پاؤں بھی زخمی کر دیا اور کھڑا مجھے پگلوں کی طرح گھور بھی رہا ہے پگلا!"

اور غونث دبے پاؤں پنگھٹ سے ہٹ کر پگڈنڈی پر آ گیا اور بھیڑوں کو کھیتوں سے نکالنے کے لئے بگٹٹ دوڑا۔ ادھر سے کھیتوں کا رکھوالا بھی پہاڑی پر سے نہایت تیزی سے اترا آ رہا تھا اور بھیڑیں مزے سے چپڑ چپڑ چر رہی تھیں!

کھیت کے قریب جا کر اس نے دو چار پتھر اٹھائے اور بھیڑوں پر پھینکے' بھیڑیں تتر بتر ہو کر ادھر ادھر دوڑ گئیں اور پھر پگڈنڈی پر اکٹھی ہو کر ایک دوسرے سے لگ کر یوں چلنے لگیں جیسے اون کا بہت بڑا ذخیرہ آپ ہی آپ کنکروں پر اوپر کی طرف کھسکا جا رہا ہو۔ پلٹ کر غونث نے پگڈنڈی کا رخ کیا ہی تھا کہ کھیتوں کے رکھوالے عطا نے زور سے ہانک لگائی۔ "ابے کہاں تک جائے گا تو مجھ سے بچ کر؟ کمینے۔ یہ تیرے باوا کے کھیت ہیں کہ تو اپنی ماؤں کو ادھر بھیج دیتا ہے؟"

غونث تو جہاں تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ گاؤں کے اتنے گرانڈیل گبرو کو یہ بڈیوں کی مٹھی عطا یوں گھرک دے۔ گرج اٹھا۔ "منہ سنبھال کر بات کر عطا ورنہ لٹا دوں گا تختے کی طرح۔ حیوان تیرے میرے کھیت کو کیا جانے۔ دو چار تنکے چر لئے انہوں نے تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑی۔ اس کے بدلے شام کو میرے گھر آ کر ایک سیر آٹا لے جانا۔"

عطا' جو پہلے ہی ہانپ رہا تھا' بے دم ہو کر بولا۔ "ابے کیا میں گداگر ہوں کہ تیرے گھر آ کر آٹے کی بھیک مانگوں۔ بھرے گھر میں اناج کے دو

دانے نہیں اور نواب صاحب مجھے بھیک دے رہے ہیں۔ ابے تیرے ایسے تو بیسیوں کتے میرے گھر کی دہلیز چاٹتے پھر رہے ہیں۔ اگر پھر کبھی تیری ان ماؤں میں سے ایک بھی ——"

غونث نے غضبناک ہو کر ایک پتھر اٹھایا اور تڑاخ سے عطا کے کلّے پر دے مارا۔ یوں آواز پیدا ہوئی جیسے کسی کتے نے کوئی بہت مضبوط ہڈی توڑی ہے۔ عطا کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ چوٹ کی شدت سے لڑکھڑا جانے کے بہانے سے اس نے تیزی سے ایک پتھر اٹھایا اور گھما کر غونث کی طرح پھینکا جو پینترا بدل کر ایک طرف کود گیا اور پتھر سیدھا ریگتی ہوئی بھیڑوں میں گرا جو "آ آ آ۔ با آ آ" پکارتیں آس پاس ڈھیریوں پر چڑھ کر نتھنے پھڑکانے لگیں۔

غونث' جواب دونوں ہاتھوں میں نکیلے پتھر اٹھائے ہوئے تھا' عطا کو ڈپٹ کو بولا۔ "دیکھ چھوکرے۔ اگر تو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو سمجھ لے کہ تیری موت کے اس فرشتے نے تیری کنپٹی ادھیڑ کر رکھ دی۔"

اور اس نے پتھر کو ہوا میں اچھالا۔ "پلٹ کر وہاں پہاڑی پر چڑھ جا اور کھیتوں کی رکھوالی کر۔ شیر کی مونچھ کترنا آسان نہیں' سمجھے؟ تیری ان شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے غلاموں کمہار ہی خوف کھائے تو کھائے۔ گاؤں کا کوئی اور گبھرو تو تجھے اپنے نتھنے کا بال بھی نہیں سمجھتا۔"

اور یہ کہہ کر جیسے غونث نے لترواں کا وہ ہار جو پنگھٹ والی چھوکری نے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا' اتار کر عطا کے منہ پر دے مارا۔

عطا پلٹ کر جاتے ہوئے بولا۔ "سمجھ لوں گا تجھ سے' سمجھ لوں گا۔"

"کیا سمجھے گا؟" غونث پگڈنڈی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "چھپکلی اگر اژدھے کو دھمکی دے تو اژدھے کا کیا بگڑ جائے گا۔"

"خیر سمجھ لوں گا۔" عطا بولا۔ اور جب غونث آس پاس بکھری ہوئی بھیڑیں اکٹھی کر رہا تھا اور عطا پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکا تھا تو اس نے غونث کو

ایسی گونجیلی اور فولادی گالی دی کہ پہاڑیاں بجنے لگیں۔ جیسے تانبے کی چادروں پر ایک دم پتھروں کا مینہ برس پڑے۔ غونث نے گھوم کر عطا کی طرف دیکھا اور پھر اس زور سے قہقہہ لگایا کہ تانبے کی چادروں پر پتھروں کی ایک بار پھر موسلا دھار بارش ہو گئی۔ گالی کا جواب قہقہہ! یہ اس کے نزدیک سب سے بڑی گالی تھی!

اور جب وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر پہنچا تو حسب معمول پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ بنسری لبوں سے لگائی۔ اس کی سانس غیر ارادی طور پر بنسری سے چیخ بن کر نکلی آس پاس کھیتوں میں ڈوب گئی اور غونث نے محسوس کیا جیسے اس چیخ میں کسی کی آواز آئی ہے۔ "غلاموں کمہار۔"

سینے کے اندر چڑ چڑ سی ہونے لگی جیسے کوئی کباب بھون رہا ہو انگاروں پر —— ایک بھیڑ کے بچے کو گود میں اٹھا کر اس کے بالوں میں منہ گھسیڑے بہت دیر تک سوچتا رہا۔ "ارے وہ غلاموں کمہار جس کی ایک آنکھ پچک کر خدا جانے کہاں گم ہو گئی ہے اور جس کے سامنے کے چار دانت مدت سے غائب ہیں! ارے وہی غلیظ غلاموں جو مجھے ملتا ہے اور میرے گھٹنوں کو چھوتا ہے' تو مجھے اس سے گھن سی آنے لگتی ہے! وہ کمبخت جس نے ایک بار اپنے تازہ بتازہ تیار کئے ہوئے گیلے گھڑے پر بیٹھے ہوئے کوے کو پکڑ کر اس کی گردن کو دانتوں سے چبا ڈالا تھا! ارے وہی غلاموں کمہار ——"

اور پھر بھیڑ کو گود سے اتار کر اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ آنکھیں' ناک' لب' سینہ' باہیں' پنڈلیاں۔ سب کو ٹٹولا۔ اور پھر اکڑ کر بولا۔ "کہاں غونث کہاں غلاموں کمہار —— کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی —— لڑکی نے مجھے اچھی طرح نہیں پہچانا!"

پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر وہ پھر لانبی گھاس میں لیٹ گیا۔ جونہی بنسری سے ایک دو سر نکالے تو اسے محسوس ہوا جیسے ہر طرف ان دکھی روحیں چیخ چیخ

کر "غلاموں غلاموں" پکار رہی ہیں۔ بنسری کو زور سے زمین پر پٹخ دیا اور سینے کو بے تابانہ ملتے ہوئے بولا۔ "اونہہ!"

"غلاموں تو چیونٹا ہے میرے سامنے۔ یوں چٹکی میں مسل دوں! میں نے عطا ایسے اکڑے ہوئے نوجوان کو دُم لگا دی۔ غلاموں بے چارا تو میری اس چھنگلیا کی مار ہے!"

مگر اس کی رگ رگ میں جیسے بالوں بھرے کیڑے رینگ رہے تھے۔

اس روز وہ جھرنے کے کنارے چوڑی چٹان پر کھانا کھانے بیٹھا تو ایکا ایکی اسے خیال آیا۔ "یہ اتنی بڑی پیاز ہے۔ اچھے اچھے پہلوان اسے دو ہتھیلیوں میں رکھ کر نہ توڑ سکیں اور میں ــــــ میں ــــــ!" اور اس نے پیاز کو ہتھیلیوں میں جما کر دبایا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا اور پھر کڑوے لعاب کی ایک دھار' چوڑی چٹان پر رینگتی جھرنے میں گرنے لگی۔ غونث نے جب اپنی گرفت ڈھیلی کی تو پیاز بھوسہ بن چکی تھی۔ اس نے بہت زور کا قہقہہ لگایا اور پھر روٹیوں کو وحشیوں کی طرح نگلنے لگا۔ اوپر سے جھرنے کا پانی پینے کے لئے جھکا ہی تھا کہ اسے جھرنے کے آئینے میں اپنا چہرہ نظر آ گیا۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ ننھی ننھی مونچھیں۔ لال رنگ۔ لہراتے بال ــــــ اس نے مسکرانے کے لئے اپنے لبوں کو جنبش دی ہی تھی کہ ایک بڑا سا مینڈک لپکا اور جھرنے میں کود کر تہ کی طرف تیر گیا۔ سطح پر ننھی ننھی لہروں کا جال سا بچھ گیا اور غونث نے اپنے سلوٹیں پڑے عکس کو دیکھ کر یوں محسوس کیا جیسے یہ مینڈک غلاموں کمہار تھا جس نے اس کے چہرے پر دنیا جہان کی لعنتیں چپکا دیں! مینڈک کو پکڑنے کیلئے وہ جھرنے میں کود گیا۔ تہ پر بیٹھی ہوئی مٹی نے ادھر ادھر ابھر کر سارے پانی کو گدلا کر دیا اور مینڈکوں کا ایک غول اپنی لمبی لمبی ٹانگیں پھیلاتا کسی نامعلوم تہ کی طرف لپک گیا۔

اس روحانی کرب سے اس کے دماغ میں جیسے لوہے کا بہت بھاری ٹکڑا

تپ کر پگھلنے کی حد تک پہنچ گیا اور پھر وہ ایک جھرنے سے دوسرے جھرنے تک' دوسرے جھرنے سے اوپر چوٹی کی جھاڑیوں کے پاس ــــــ جھاڑیوں سے دور اندھیری کھاڑیوں میں گول مول پتھروں کے انبار کے قریب ــــــ وہ گھومتا پھرا۔ اور جب سورج پچھم کے پہاڑوں پر سرسوں سی بکھیرنے لگا تو وہ گاؤں کو پلٹا۔ پنگھٹ کے قریب پہنچا تو ادھر سے غلاموں کمہار دو گدھے ہانکے آ رہا تھا۔ جان بوجھ کر غونث نے اس کے قریب سے گزر کر اس کے شانے سے شانہ بھڑا دیا اور پھر کڑک کر بولا۔ "ابے اندھا ہے تو۔ ابھی ایک آنکھ تو سلامت ہے تیری۔ راہ دیکھ کر نہیں چلتا؟" اور غلاموں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "غلطی ہو گئی ملک۔ بھول ہو گئی۔ بخش دے۔"

"کمینہ!" غونث نے جیسے دماغ میں سے بھاری لوہا اور رگوں میں سے بالوں بھرے کیڑوں کو گھسیٹ کر پرے پٹخ ڈالا ہے! پنہاریاں ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں۔ "اری کون ہے یہ؟" "غونث ہے نا' محبت خان کا لڑکا!" ــــــ "بڑی آگ ہے اس میں" ــــــ اور ایک بڑھیا نے اپنے سن کی رعایت سے ایک جھوٹ تول دیا۔ "بڑا جیلا چھوکرا ہے' غلاموں کی موت آئی تھی کہ اس کی راہ میں آ گیا۔ سنا ہے اس نے پرسوں ایک بیل کے گھونسا مارا اور وہ زمین پر بچھ گیا۔ ٹانگ تک نہ کھینچی کمبخت نے!" ــــــ اور ادھر سے ایک اور ادھیڑ عمر کی پنہاری بولی۔ "اری یہی تو ہے جس نے عطا کا کلا دھن دیا ہے آج!"

سب لڑکیاں دانتوں تلے انگلی دبائے بہت دیر تک غونث کو دیکھتی رہیں جو اب نہایت تیزی سے گلی کا موڑ کاٹ رہا تھا!

اور غونث سوچتا جا رہا تھا "اس چھوکری کو کتنی غلطی ہوئی ہے۔ شاید غلاموں کمہار کا لفظ یونہی بے مطلب اس کے لبوں سے ٹپک پڑا تھا۔ وہ اگر اب یہاں پنگھٹ پر ہوتی اور میری گرج سنتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ غونث کوئی معمولی دل گردے والا نوجوان نہیں" ــــــ اس نے کاندھے جھٹکا کر سینہ تان

لیا اور جب گھر آیا تو خلاف معمول تن کر چلنے سے اس کی کمر دکھ رہی تھی!

رات بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ کاش وہ لڑکی وہاں پنگھٹ پر موجود ہوتی اور پھر گاگر ٹوٹ گئی تو میرا کیا قصور تھا۔ خود گاگر کے پیندے پر سبز چکناہٹ لپٹی ہوئی تھی۔اس پر تو رستم کا ہاتھ بھی نہ جم سکتا۔ سارے گاؤں میں کسی کو خاطر میں نہ لانے والا اب اس کے سامنے آنکھیں تک نہ اٹھا سکے گا۔" اس کے نزدیک تو میں ——میں——" اور ساری دنیا کے بزدل جانور اس کے سامنے آئے اور دمیں ہلاتے کہیں غائب ہو گئے۔

اور جب صبح اٹھ کر اس نے باڑے سے بھیڑیں نکالیں اور پنگھٹ کے پاس سے گزرا تو وہی لڑکی اسی حالت میں کھڑی نظر آئی۔ غونث کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا اور کسی اور راہ چلتے کے انتظار میں دوسری طرف دیکھنے لگی کہ اچانک غونث اس کے قریب آگیا۔ "لاؤ میں گاگریں سر پر رکھ دوں۔"

اور وہ تن کر چلی۔ "میں اپنی گاگروں کی دشمن ہوں کیا۔ جا اپنی راہ لے۔"

غونث نے لجاجت سے کہا۔ "اری تیری اس گاگر کے پیندے سے سبز چکناہٹ لپٹی ہوئی تھی۔ ورنہ میرا تجھ سے کون سا بیر ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ تیری گاگر بھی توڑی۔ تیرا پاؤں بھی زخمی کیا اور تیری نفرت بھی مول لی۔ میں تو بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے پانچ پانچ من کے پتھر ایک ہاتھ پر اٹھا کر گھمائے ہیں اور کنکروں کی طرح پرے پھینک دیئے ہیں۔ یہ گاگر کیا چیز ہے میرے سامنے۔ لا۔"

اور اس نے ایک گاگر اٹھا کر لڑکی کے سر پر دھر دی اور دوسری کو کچھ اس انداز سے پہلی گاگر پر جمایا کہ کوئی آواز نہ آئی۔ لڑکی کے قدم تک نہ ڈگمگائے لڑکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اوپر سے کسی نے پھول پھینک دیا ہے۔ وہ مسکرائی۔ "واہ رے۔ آج تو غضب ڈھا دیا تو نے۔ گاگر رکھی بھی ہے سر پر؟

مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلا۔"

اور غونث کے ماتھے پر مسرت کا پسینہ پھوٹ نکلا۔ بولا۔ "مجھے کل کی بات کے لئے معاف کرنا۔ دراصل اس گاگر کی قسمت ہی میں پھوٹنا لکھا تھا ورنہ ——"

"کوئی بات نہیں۔" لڑکی نے جاتے ہوئے کہا۔ "غلاموں کمہار زندہ ہے تو گاگروں کی کیا پروا ہے؟" اور غونث کے دل کو جیسے کسی نے چٹکی سے نوچ لیا ہے۔ گھبرا کر لڑکی کی طرف دیکھا جو کھلکھلا کر ہنس پڑی اور غونث بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔ اور یونہی غیر محسوس طور پر غونث نے اس کے مسکراتے ہوئے لبوں کے گوشوں کی مبہم کپکپاہٹیں اپنی آنکھوں میں بسا لیں اور پھر جب ادھر بھیڑوں کی طرف دیکھا تو وہ کل کی طرح کھیتوں میں مزے سے چر رہی تھیں۔ بھاگا بھاگا کھیت کے قریب پہنچا ہی تھا کہ چٹان کی آڑ سے عطا نے اٹھ کر اس پر پتھروں کا مینہ برسا دیا۔ اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر کھاٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر' باہوں' سینے اور پنڈلیوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور چہرے پر صرف ہونٹ اور آنکھیں کھلی تھیں سب سے پہلے اس کے ذہن میں پتلے پتلے ہونٹوں کے نقوش ابھرے جن کے مبہم گوشے پھڑک رہے تھے اور پھر اسے عطا یاد آگیا اور پھر ——پھر——!

"پھر کیا ہوا؟" اس نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔

اور اس کی ماں جو پائنتی پر بیٹھی رو رہی تھی۔ بولی۔ "کیا ہوا! کچھ نہیں ہوا! بس عطا نے اپنی موت کو بلایا ہے' تو اچھا ہو لے میرے لال۔ پھر میرے پاس اس کے وہ ہاتھ کاٹ لانا جن سے اس نے تجھ پر پتھر پھینکے' میں انہیں بھون کر بلی کے آگے ڈال دوں گی۔ بیچاری کئی روز کی بھوکی ہے۔"

غونث نے پوچھا۔ "لیکن مجھے وہاں سے اٹھا کر کون لایا۔"

اور اس کی ماں بولی۔ "اس وقت شاید پنگھٹ پر شریف خاں کی لڑکی

مہتاب پانی بھر رہی تھی۔ تمہاری لڑائی کا شور سنا تو بھاگی بھاگی آئی اور سارے گاؤں کو اطلاع دی۔ خدا بھلا کرے بے چاری کا۔ ہم سب وہاں پہنچے تو تو پتھروں پر لہولہان پڑا تھا۔ اور وہ شیطان کا بچہ عطا غائب تھا۔ ہم پر مہتاب نے احسان کیا ہے۔ بے چاری میرے پاس ابھی تک بیٹھی رہی۔ ماں بھی ساتھ تھی اس کے۔ اگر وہ ہمیں اطلاع نہ دیتی تو ـــــــ تو ـــــــ" اور غونث کی ماں کی آواز بھرا گئی۔

غونث مسکرا کر بولا۔ "تو گدھیں اور کوے اور ـــــــ" وہ زور سے ہنسا۔ "خیر دیکھا جائے گا۔ دیکھ لوں گا۔ اچھا!" اور اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونا شروع ہو گئیں۔ اور جب ان کے پوری طرح بند ہونے میں صرف ایک ذرا سی جھپکی کا وقفہ تھا تو غونث مسکرانے لگا۔ اسے سامنے چھت پر مہتاب کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ تیرتے نظر آئے اور پھر ان میں حرکت ہوئی ـــــــ اور انہوں نے کہا ـــــــ! یہ اس خواب کی ابتدا تھی جو شام تک سوتے ہوئے غونث کے خیالات پر منڈلاتا رہا۔ وہ خواب جس کے ختم ہو جانے پر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے دھچکا سا لگا۔ اور وہ چیخ کر بولا۔ "مجھے سونے دو!" اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔ "بے چارے کے دماغ پر اثر پڑا ہے" اور پھر قریب ہی کھڑے ہوئے غلاموں کمہار نے یہ بات چوپال پر جا کر کہہ دی کہ غونث کا دماغ چل گیا ہے، اور پھر گلی گلی یہی تذکرے ہونے لگے کہ "غونث دیوانہ ہو گیا ہے۔ بے چارہ غونث!"

لیکن غونث دیوانہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے تو شعور اور احساس کے اس وسیع کرے میں قدم دھرا تھا جہاں ہر طرف روشنیاں اور دھندلکے آپس میں لپٹے پڑتے تھے اور جہاں رات اور دن کے سکوت اور ہنگامے آپس میں دست و گریباں تھے۔ بیماری کے ایام میں اس نے بہت سی باتیں سوچیں، بہت عجیب عجیب باتیں۔ اگر یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اگر یوں ہو جائے تو کیا ہو جائے۔ اگر

کچھ بھی نہ ہو تو کیا ہو۔ اس کے دماغ پر بے شمار لاانتہائی تار پھیل گئے لیکن یہ تار شفاف تار تھے۔ کبھی کبھی وہ تاباں مستقبل کے سامنے آ کر چاندنی کی کرنوں کی طرح جگمگا اٹھتے اور کبھی مبہم سوچوں کے دھندلکوں میں لپٹ کر دھوئیں کی باریک دھاریاں بن جاتے۔ اس کی ماں اسے اکثر بتاتی کہ آج پھر مہتاب اپنی ماں سمیت اس کا حال پوچھنے آئی تھی۔ اور غونث کی نبضیں یوں دھڑکتیں جیسے اس کے زخموں کے کھرنڈ پر کوئی ہدہد بیٹھا ٹھونگیں مار رہا ہو۔ ان تمام دنوں میں عطا اس کے ذہن پر بہت کم ابھرا۔ اور جب ابھرا تو اپنے لال لال دیدے پھیلاتا پھر انہیں گہرائیوں میں ڈوب گیا!

اور پھر ایک روز ایسا بھی آیا کہ جب مہتاب آئی تو وہ جاگ رہا تھا۔ کواڑ کو پار کر کے جب اس کی نظریں صحن میں گھومتی ہوئی دیوار تک پہنچیں تو اچانک اس کے زخموں پر وہی ان دیکھا ہدہد چونچ تیز کرنے لگا! اس کی پتلیوں پر ایک آبی پردہ سا پھیل گیا اور پھر جب اس نے آنکھیں ملیں تو اسے مہتاب نظر آ گئی نیچی نظریں کیے۔ پاؤں کے انگوٹھے کے زخم پر تنکا پھیر رہی تھی۔ اور پھر جب اس کی پلکیں جنھوں نے اس کے گالوں پر سائے پھیلا رکھے تھے، اٹھیں تو غونث نے یوں محسوس کیا جیسے ساری کائنات اوپر ابھر کر فضاؤں میں معلق ہو گئی ہے! جیسے سپیرے نے سانپوں بھرے پٹارے پر سے ڈھکنا اٹھا دیا ہے اور سانپ لہرا لہرا کر آس پاس رینگتے پھر رہے ہیں۔ جیسے کسی تشنہ لب کی اوک میں کسی غیر محسوس ساقی نے آبِ زم زم کے مٹکے انڈیل دیئے ہیں ـــــــ! بہت سی باتیں اس کے ذہن میں آئیں۔ مہتاب کی پلکیں جھپک کر پھر اٹھیں۔ ادھر ادھر گھوم کر اس کی نگاہیں غونث پر جم گئیں اور غونث نے اتنی طویل انگڑائی لی کہ اس کی چھاتی پر بندھی ہوئی پٹیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اور پھر مہتاب جانے کے لئے اٹھی۔ اپنے پرانے میلے آنچل کو تان کر سینے پر پھیلاتی، بوسیدہ جوتے گھسیٹتی، دو تین ادھر جھکی ہوئی لٹوں کو ادھر کانوں کے پیچھے جماتی، جب وہ غونث کی کوٹھڑی کے

سامنے سے گزری تو غوثش نے اپنے خشک گلے سے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز نکالی۔ "اچھی ہو مہتاب؟" مہتاب ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پھر گھوم کر ایک طرف ہو گئی اور ایک انگلی کے ناخن کو اپنے دانتوں سے جیسے کترنے لگی۔ مہتاب کی ماں اندر غوثش کے پاس آ گئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی ماں کو مخاطب کرتی ہوئی بولی۔ "لے' اب تو اچھا ہے تیرا لال۔ منہ پر لالی آ رہی ہے۔"

اور غوثش کی ماں ناک پر انگلی دھرتی ہوئی بولی۔ "لالی میرے لال کے چہرے سے گئی ہی کب تھی!——— دو چار خراشیں تھیں۔ کل پرسوں تک دوڑنے بھاگنے لگے گا۔ بوڑھے باپ کو پہاڑوں پر جانے کی تکلیف سے بچالے گا ———اور ——— اے مہتاب بیٹی اندر آ جا۔ باہر دھوپ میں کھڑی کیوں جل رہی ہے؟"

مہتاب اندر آ گئی اور غوثش کے سینے کے زخموں میں پھر بے شمار لمبی لمبی نکیلی چونچیں چبھنے لگیں!

"اچھے ہو غوثش؟" اس نے پوچھا۔ اور اس کے سارے جسم کا خون اس کے گالوں میں سمٹ کر یوں تمتانے لگا جیسے پکے پھل کی طرح اس کا رس آپ ہی آپ رسنے لگے گا۔ اس کے مرمت شدہ چولے کے دو ایک ٹانکے ادھڑ گئے تھے جس میں اس کی مرمریں جلد کی ایک شعاع سی نکل رہی تھی!

اور غوثش دم بخود لیٹا سوچنے لگا کہ یہ مردوے خود پانی کیوں نہیں بھرتے' خود کھانا کیوں نہیں پکاتے' کڑکتی دوپہروں میں خود چڑیاں کیوں نہیں اڑاتے' یہ نازک نازک پھول' یہ نور میں ڈھلی ہوئی پتلیاں کیا ایسے کاموں کے لائق ہیں!——— اور اس نے دل ہی دل میں موجودہ گھریلو نظام کو بدلنے کے کئی دہقانی طریقے سوچے۔

پھر مہتاب اور اس کی ماں چلی گئیں اور غوثش دو چار دنوں کے بعد

صحن میں گھومنے پھرنے لگا۔

ایک روز لاٹھی ٹیکتا چوپال پر گیا تو اسے سامنے عطا بیٹھا نظر آیا۔ لاٹھی اٹھی مگر پھر زمین کی طرف جھک گئی اور اس نے سوچا کہ انتقام کے شعلوں پر پانی چھڑکنے کا یہ موقع نہیں۔ پنگھٹ کے قریب والے کھیت ہی اس مقصد کے لئے موزوں رہیں گے۔

اور پھر جب وہ مدت کے بعد بھیڑیں ہنکائے ان کھیتوں کے قریب سے گزرا تو اسے عطا دور پہاڑی پر کھڑا نظر آیا۔ اور پھر آن کی آن میں وہ پہاڑی کی پرلی طرف اتر گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا جسم غصے سے تپ کر انگارہ بن گیا لیکن اسے ان فروعی باتوں کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے اس تپش پر خنک بوندیاں سی برسانا شروع کر دیں۔ مہتاب کے ہونٹوں اور آنکھوں اور گالوں کے ہیولے سامنے نیلے آسمان پر تیرنے لگے!

چوٹیوں کی تیز اور ٹھنڈی ہوائیں اپنے بچھڑے ہوئے دوست کی بلائیں لینے لگیں۔ وہ گھاس میں پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹا ہی تھا کہ اچانک اسے کمر میں کوئی چیز چبھی۔ کروٹ بدل کر دیکھا تو زور سے قہقہے لگاتا بولا۔ "ارے! میری بنسری!"——— اس نے اپنی گرد آلود بنسری اٹھالی اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس کا جائزہ لیا۔ اچانک دو چار ٹڈیاں اس کے اندر سے نکلیں اور پھدکتی ہوئی گنجان گھاس میں غائب ہو گئیں۔ اور اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "میری مظلوم بنسری! ٹڈیاں گھس گئیں تجھ میں؟ گرد جم گئی تجھ پر؟ اررے!" اور اس نے پگڑ کے اک پلو سے اسے جھاڑا۔ "ارے بچھڑی ہوئی پیاری چیز دل سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے!"——— اور زبان کی نوک سے ہونٹوں کو تر کر کے اس نے بنسری بجائی۔ بنسری بلبلانے لگی جیسے کہہ رہی ہے۔ "چھوڑ دے ظالم۔ پھینک دے مجھے۔ بڑا آیا پیار کرنے والا۔ میں اب یہیں اچھی ہوں لاش پر آب حیات چھڑکتا ہے۔ رہنے دے۔ دیکھ تو دھوپ نے میرا روغن ہی اکھیڑ

پھینکا ہے!"

غونث بشری کی باتیں سمجھ گیا۔ اسے بغل میں دبا کر وہ جھرنے پر آیا۔ اور ٹھنڈی صاف چٹان پر بیٹھا ہی تھا کہ اسی چٹان کی اوٹ سے ایک شعلہ سا اٹھا! ایک مجسم شعلہ! گھبرائی ہوئی مہتاب! جس کی آنکھوں کے کٹوروں سے خوف' حیا اور مسرت کے خمار چھلک رہے تھے' اور جس کی اماوس کی راتوں ایسے کالے بال اس کے پھٹے پرانے دوپٹے کی گرفت سے نکل کر اس کے سینے کے نشیب و فراز پر لہرا رہے تھے!

"تم؟" غونث بولا۔ اور اس کی بشری اس کی بغل سے نکل کر چٹان پر کھڑکھڑاتی نیچے گیلی مٹی میں جا گری۔ اور پھر اسے بشری کا ـــــ اس بچھڑی ہوئی پیاری چیز کا خیال نہ رہا۔ اس کے سامنے اب بشری سے زیادہ رسیلی چیز کھڑی تھی۔ مہتاب کے لبوں پر گھبرائی ہوئی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہراساں اور متذبذب مسکراہٹ' جیسے وہ مسکرانا چاہتی بھی ہے اور مسکرانا نہیں بھی چاہتی!

"تم مہتاب؟" غونث نے چٹان پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ارے تم؟"

اور مہتاب کے لبوں میں حرکت آئی جیسے بند کلی سے بھونرے کے نکلتے وقت نرم پنکھڑیاں تھرتھرا جاتی ہیں۔ "ہاں میں۔"

"تم کہاں؟" ـــــ آس پاس چرتی ہوئی بھیڑیں آنکھیں جھپکانے لگیں!

"گھاس کاٹنے آئی ہوں۔" اس نے زمین پر سے رسی اور درانتی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہیں گھاس نہیں کاٹنی چاہئے!"

"کیوں؟"

"تمہارے ہاتھ کھردرے ہو جائیں گے!"

اور مہتاب مسکرا دی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں گھبراہٹ یا تذبذب نہ تھا۔ یہ تو صاف ستھری نئی نئی صبح کی طرح بے داغ مسکراہٹ تھی۔ ادھر غونث بھی مسکرانے لگا اور ان مسکراہٹوں نے تصادم سے جو شعلہ ٹوٹا وہ دونوں کے دلوں کو جھلستا ان کے رگ و پے میں سرسرانے لگا!

"عطا بڑا ظالم ہے۔" مہتاب بولی۔

"میں اسے مزا چکھا دوں گا کسی دن۔" غونث تن کر بولا۔

"لیکن تم قید ہو جاؤ گے۔" مہتاب بولی۔

"ہونے دو قید۔ سینے میں یہ سلگتا ہوا تنور تو ٹھنڈا ہو گا۔" اس نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"لیکن ٹھنڈے تنوروں میں روٹیاں نہیں پکتیں۔ جل جاتی ہیں' یا لٹک کر نیچے راکھ میں گر جاتی ہیں۔"

"کیسی روٹیاں؟" غونث نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مہتاب مسکرا کر بولی۔ "ارے! میں کیسی بات کہہ گئی!"

لیکن غونث سوچنے لگا کہ واقعی وہ عطا کو اس کے کئے کا پھل دینے کی دھن میں قید ہو جائے گا۔ اور پھر یہ مہتاب ـــــ یہ مہتاب ـــــ یہ مہتاب! اس کے خیالات مہتاب سے پرے نہ جا سکے۔ یہیں ہجوم ہو گیا ان کا۔ نہیں۔ وہ قید نہیں ہو گا۔ خدا بڑا منصف ہے۔ وہی عطا سے نبٹ لے گا۔

اور یوں اس کے سینے کا تنور یخ بستہ ہو کر رہ گیا!

اس نے مہتاب کے لئے گھاس کاٹی' گٹھا باندھا اور پھر اس کے پاس آ کر بولا۔ "میں اٹھا لاؤں گا یہ گٹھا۔ تم تھک جاؤ گی۔"

"میں نہیں تھکتی۔ ایسے دو گٹھے اٹھا لیتی ہوں میں!"

"اچھا!" ـــــ اور غونث نے ہنستے ہوئے گٹھا اٹھا کر اس کے سر پر

دھرا تو وہ ڈگمگا گئی ـــــ اور چلائی۔ "ارے ذرا ہلکا کر اسے۔ اس میں پتھر تو نہیں لپیٹ دیئے تو نے۔"

قہقہوں سے یہ ٹھنڈی کھاڑی گونج اٹھی۔ غونث نے گٹھا کھول کر اسے ہلکا کیا اور پھر جب مہتاب جانے لگی تو وہ بولا۔ "مہتاب۔ گھاس کاٹنے ادھر ہی آ جایا کرو۔ یہاں میں تجھے مدد بھی دوں گا اور پھر یہاں گھاس بھی عام ہے۔"

"گھاس تو پوربی پہاڑیوں پر بھی عام ہے۔" وہ گٹھے کو پیچھے ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں ادھر ہی آ جایا کروں گی۔"

اور غونث کی سانسیں فرط مسرت سے آپس میں گتھم گتھا ہو کر رہ گئیں!

مہتاب روز وہاں آنے لگی۔ دن ڈھلے تک جھرنے کے آئینے میں دونوں کے عکس کانپتے رہتے۔ دیر تک وہی باتیں ہوتی رہتیں جو حضرت وارث شاہ ہیر کے قصے میں لکھ گئے ہیں۔ اور پھر ایک روز عہد و پیمان بھی ہوئے۔ چھلے بھی بدلے گئے' کپکپاتے ہونٹ بھی ایک دوسرے کو چھو گئے' زلفیں بھی باہوں پر بکھر گئیں اور گال سے گال بھی ملے۔ یعنی وہی کچھ ہوا جو ایک لڑکی لڑکے کی محبت کے دوران ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا جائے گا۔

اور پھر اچانک یورپ کی قیامت خیز جنگ چھڑی' رکروٹنگ افسر اس گاؤں میں بھی آئے' نوکری کی دھن میں غونث بھی لنگوٹا باندھ کر امیدواروں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اور جب صاحب اس کے مقابل آئے تو بولے۔

"ول۔ یہ جوان بڑا لڑاکا معلوم ہوتا۔ اس کا سارا باڈی زخم زخم ہے۔ ول۔ تم جوان کا نام مانگتا۔"

"غونث" وہ بولا۔

"گھونس" صاحب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور اسی قطار میں کھڑے ہوئے عطا نے اپنے ایک ساتھی کو ٹھوکا دیکر کہا۔ "کچھ سنا ـــــ گھونس!"

اور غونث کے سینے کے بیچ بستہ تنور سے دو چنگاریاں سی ابھر کر بجھ گئیں۔

صاحب جب عطا کے مقابل آئے تو بولے۔ "ول۔ تم لوگ کا چھاتی اس ماپھک" ـــــ اور انہوں نے ہاتھ کی انگلیاں تان کر ہوا میں ایک بالشت بنائی۔ "اس ماپھک سے بھی تھوڑا کم۔ تم لوگ نامرد ہے" ـــــ عطا قطار سے باہر دھکیل دیا گیا۔

اور غونث ہنسی ضبط کرتے ہوئے قریب کے نوجوان کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ "ارے سنا تو نے؟ ـــــ نامرد!" اور عطا کی چھاتی اور بھی سمٹ گئی!

اس روز شام کے بعد غونث نے غلاموں کمہار کو اپنے ہاں بلایا اور بولا۔ "لے بھئی۔ ایک کام کر۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے ورنہ ہم دونوں کل قبروں میں پڑے سڑ رہے ہوں گے۔ لے یہ پانچ روپے۔ ادھر شریف خاں کے گھر چلا جا۔ شریف خان اور اس کی گھروالی باہر ایک شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی بیٹی مہتاب ہے نا۔ وہ بیٹھی ہو گی دالان میں۔ اسے میرا نام کہیو۔ ہے نا؟ پھر اسے یہ چھلا دکھا دیجو۔ سمجھے؟ اور پھر کہیو۔ کہ ادھر گاؤں کی اتری کھاڑی میں ـــــ وہ تمہارے آوے سے کچھ ہٹ کر ـــــ بس وہیں آ جائے وہ ـــــ اور کہیو غونث بھرتی ہو گیا ہے فوج میں ـــــ جا! لیکن دیکھو۔ اگر کسی کو پتہ چلا تو یہ دو چار بچے کھچے دانت بھی توڑ ڈالوں گا۔ لے بھاگ جا۔"

اور غلاموں پانچ روپوں کا نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے بولا۔ "ارے ملک۔ کیسی باتیں کرتا ہے تو۔ فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے گا۔ ہم نے یہ مونچھیں دھوپ میں سفید نہیں کیں۔" ـــــ غلاموں کے ڈاڑھی نہیں تھی!

غونث دیر تک اندھیری کھاڑی میں بیٹھا گول مول سنگریزوں سے کھیلتا

رہا اور پھر جب نیا نیا چاند دور اندھیرے غاروں میں گر گیا تو مہتاب آ نکلی بھیگی ہوئی آنکھیں' بھیگی ہوئی پلکیں' بھیگے ہوئے گال' بھیگا ہوا آنچل۔ سسکیاں بھرتی دھڑام سے غونث کے قریب گر گئی۔

غونث نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور بولا۔ "اری صبر کر۔ لوٹ آؤں گا میں۔ پہلے یہیں جبل پور میں سکھلائی ہو گی ہماری۔ پھر میں چھٹی پر آؤں گا۔ اور پھر ——— پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا پگلی!"

"ہاں میں پگلی۔" وہ روتی بسورتی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور تو بڑا دانا۔ سولہ سترہ ٹھیکریاں قبول کر لیں۔ اور مجھے پرے پھینک دیا۔ تجھے تو چاندی پیار ہے۔ میں تو یونہی تم سے چمٹی پھرتی رہی ——— چاندی کا اتنا شوق تھا تو مجھے کہتا۔ میں چکی پیس کر تجھے اتنی رقم کما دیتی۔ یہ لو اپنا چھلا" ——— اس نے انگلی سے چھلا اتارنے کی کوشش شروع کر دی۔

"اری۔ تو تو دیوانی ہو گئی ہے مہتاب۔" غونث نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "نوکری کرنا ہی پڑتی ہے پگلی ——— اور پھر تم جانتی ہو' میرا ابا بہت بوڑھا ہو چکا ہے ——— اب میں ہی تو کمانے والا ہوں سارے گھر میں۔"

"بڑا کماؤ کہیں کا!" مہتاب بولی۔ "یہ کمبخت چھلا نہیں اتر رہا ورنہ میں تجھے واپس دے دیتی۔ تو ادھر عجیب عجیب ملکوں میں چلا جائے گا۔ مزے سے دودھ پیئے گا۔ گوشت کھائے گا۔ ہر مہینے تیری جیب بھاری ہوتی جائے گی۔ میری یاد چاندی کے ڈھیر تلے دبتی جائے گی۔ میری کب پروا کرے گا تو!"

اور غونث نے مہتاب کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اری تو تو میرے دل میں بسی رہے گی مرتے دم تک۔ تو تو میری زندگی ہے پگلی ——— دیوانی تو تو میری خوشی ہے۔ تیرے ہی لئے تو اپنی جیبیں بھر لاؤں گا میں" ———

اور پھر جب دو بھیگے ہوئے لب۔ دو تپتے ہوئے لبوں سے ملے تو مہتاب کی ہچکیاں بندھ گئیں اور غونث کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں!

"اب تم رو دیئے؟" وہ بولی۔ "مجھے یاد رکھو گے نا؟ مجھے یاد رکھنا' سمجھے؟"

اور غونث گھٹی ہوئی آواز میں بولا "اری اتنی پیاری چیز کو بھلا دوں تو موت سے پہلے نہ مر جاؤں! بس کُل دس مہینوں کی تو بات ہے۔" اور پھر غونث نے دس چٹکیاں بجا کر کہا۔ "یوں گزر جائیں گے یہ دس مہینے۔"

مہتاب بولی۔ "میرا تو دسویں چٹکی کے انتظار میں کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ اور تم دس مہینوں کے لئے جا رہے ہو۔ لیکن دیکھو۔ مجھے یاد رکھنا۔ سمجھے؟"

اور پھر دوسرے روز غونث جبل پور روانہ ہو گیا۔

وہاں اس نے امیدوں کے بہت سے ایوان بنائے۔ شیشہ جھنڈی کی مشق کرتے ہوئے اس نے کئی بار ان ایوانوں میں مہتاب کو مسکراتے دیکھا اور پھر اپنے آپ کو بھی انہیں گونجتی چھتوں کے نیچے ٹہلتا محسوس کیا!

بہت ہولے ہولے گزرے یہ دس مہینے اور جب آخری دن آیا تو غونث نے یوں محسوس کیا جیسے دس چٹکیاں بجانے سے بھی زیادہ تیزی سے یہ دس مہینے لڑھک گئے ہیں!

اس روز سب سپاہی بازاروں میں گھروں کے لئے سودا خریدنے گئے تو غونث ایک بازار کے پرلے سرے پر کپڑے کی ایک الگ تھلگ دکان میں جا گھسا اور بولا۔ "آنکھ کے نشے کی قمیض۔ زنانہ۔ اور ہل جل کی چادر۔ زنانہ۔ اور جارجٹ۔ دوپٹے کے لئے۔ لاؤ کھا جلدی۔"

اور دکاندار اپنی بڑی بڑی بھوری مونچھوں کے پیچھے مسکرایا۔ "شادی ہونے والی ہے بابو جی!"

سیٹھ نے جیسے غونث کا عزیز ترین راز اس کے سینے سے کھینچ کر فرش پر پٹخ دیا ہے' گھبرا سا گیا۔ بولا۔ "ہاں ہاں۔ کسی کی شادی ہونے والی ہے۔ لے

ذرا جلدی کر۔"

قیمتی ریشمی کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دباتا وہ اپنی بارک میں آیا۔ اسے ٹرنک میں سب چیزوں کے نیچے چھپا دیا۔ اور پھر اس روز کمبخت گاڑی بڑی دیر سے آئی۔ اور جب چلی تو کچھوے کو مات کرتی تھی۔ اور لاری بے چاری کے تو جیسے چاروں پہیے پنکچر تھے۔ اور پھر قصبے میں اتر کر ٹرنک سر پر رکھتا وہ اس تیزی سے گاؤں کی طرف چلا کہ دوسرے سپاہی اسے دیکھ کر بہت دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔!

گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے رستے میں اتری کھاڑی پڑتی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اور پھر غلاموں کمہار کا آوا اور پھر غلاموں کی آواز۔ "دور بلائیں میرے ملک کی۔ دور بلائیں۔ ارے دن کو عید کا چاند دکھائی دے رہا ہے مجھے۔ ٹھہر جا ملک۔ میں اٹھا لوں بکس۔"

اور جب غوث نے غلاموں سے ہاتھ ملا کر ٹرنک نہایت بے دلی سے اس کے سر پر رکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ریشمی کپڑوں کی پوٹلی اچھل اچھل کر ٹرنک کے ڈھکنے کو پھاڑ کر باہر نکل جانا چاہتی ہے اور ناچنا چاہتی ہے غلاموں کے سامنے۔ اور کہنا چاہتی ہے کہ ہم جبل پور سے آئے ہیں!

"شام کو آئیو میرے پاس سمجھے" گھر کے قریب پہنچ کر غوث بولا۔ "اب یہ بکس مجھے دے دے۔"

غلاموں شام کو آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا گیا۔ گھر آ کر غوث ماں باپ سے مل کر چوپال پر نکل گیا۔ لمبا کلف لگا طرہ ہوا میں پھیلا ہوا تھا اور لٹھے کی چادر قدم قدم پر چیخ چیخ اٹھتی تھی——اور پھر وہ کالی گرگابی اور گلابی واسکٹ اور وہ پتلی سی چھڑی——اسے ایک جگہ چین ہی نہیں آتا تھا۔ کبھی اس گلی میں جا رہا ہے' کبھی اُس گلی میں۔ کبھی یہاں بیٹھا ہے کبھی وہاں۔ کبھی گھر میں ہے تو کبھی آوے کے پاس——اور ایک بار تو وہ اتری کھاڑی میں بھی

جھانک آیا۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ غلاموں آنکلا۔ اور جب دس روپوں کا نیلا نوٹ اس کی انگلیوں میں اٹکا دیا گیا تو اس کی بیٹھی ہوئی آنکھ بھی پھڑک گئی۔

"کہو۔" وہ بولا۔

"ارے تو ابھی تک نہیں سمجھا!" غوث بولا۔ "مہتاب کی بات بھول گیا تو؟"

"کھی کھی کھی کھی" وہ دو ایک جھولتے ہوئے پیلے دانت نکال کر ہنسا۔ "کھی کھی کھی کھی۔ قرآن کی قسم میں بھول گیا تھا۔ نہیں نہیں نہیں نہیں! کئی بار گلیوں میں مل جاتی ہے۔ لیکن وہ بات تو بالکل اتر گئی یاد سے۔ عمر گزر گئی ہے نا۔ یہ اپنے اپنے زمانے کی باتیں ہیں۔ کہاں آئے وہ؟"

"وہیں۔"

"اچھا وہیں!——"

اور پھر جب بہت دیر تک ریشمی کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے کھاڑی میں بیٹھا وہ اندھیرے میں ابھرتے ہوئے موہوم دھبوں کو گھورتا رہا تو کنکروں پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ کھسک کر ایک گول سے پتھر کے پیچھے چھپ گیا——

"ارے ملک کدھر گیا تو؟!" گاموں کی بھیانک آواز آئی۔

اور غوث کی امیدوں کے ایوان اینٹ اینٹ ہو کر بکھر گئے۔ پتھر کی اوٹ سے نکل کر پوچھا۔ "کدھر ہے وہ؟"

"نہیں نہیں نہیں نہیں!" وہ ہنسا! "ارے ملک۔ ڈر گیا تو؟ وہ آج گھر میں نہیں ہے۔ میں اس کے باپ کے کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا اور یونہی باتوں باتوں میں پوچھ کہ کدھر گئی مہتاب بیٹی۔ بولا۔ کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے۔"

"اچھا تو پوچھے سہی۔" غوث نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "اسے صبح

صبح موقع پا کر کہیو کہ ادھر پچھمی پہاڑیوں میں بڑے جھرنے کے کنارے مجھے ملے۔ لیکن دیکھ مجھے آکر یہاں بتا جائیو کہ اس سے بات ہوئی ہے یا نہیں۔ مفت میں ٹانگیں نہ نکالتا پھروں۔"

رات جوں توں گزر گئی۔ سفر کی تکان کی وجہ سے اس کی آنکھیں کئی بار آپ ہی آپ بند ہو جاتیں' مگر پھر اس کے دل پر جیسے کوئی گھونسا لگا دیتا اور وہ کروٹ بدل کر پو پھٹنے کا انتظار کرنے لگتا۔

پو پھٹی۔ مشرقی افق پر پگھلی ہوئی چاندی کا سیلاب سا ابھرنے لگا اور پھر سورج نے اپنا سر اٹھایا۔ ہر چیز میں زندگی جاگ اٹھی۔ غونث اٹھ کر مکان سے باہر غلاموں کی راہ دیکھنے لگا اور آخر وہ گلی کے موڑ پر سر جھکائے آتا نظر آیا۔

غونث نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "بول بھی' اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

لور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ "ادھر آ جا ملک۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

لیکن اس وقت اگر دیواروں کی آنکھیں بھی ہوتیں تو وہ صبر نہ کر سکتا۔ بولا "یہیں سب کچھ کہہ ڈال۔ ملی؟"

"ہاں ملی۔" اس نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔

"پھر؟"

"پھر باتیں ہوئیں۔ میں نے تمہارا پیغام سنایا۔ تو بولی۔ اچھا آ گیا ہے وہ لونڈا!! ——— معاف کرنا ملک۔ اسی کے الفاظ دہرا رہا ہوں ——— کہنے لگی آ گیا ہے وہ؟ چاندی سونے کا بھوکا چھوکرا جسے عطا نے کتے کی مار دی تھی اور باؤلا کر دیا تھا۔ وہ اب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ اسے جا کر کہہ دے کہ میں تیرا انتظار کب تک کرتی۔ تین سو دن تک کون راہ دیکھتا تیری؟ تو نے سترہ ٹکیوں سے بھی مجھے ہیٹا سمجھا۔ میں اب عطا کی ہوں۔ تیرے دشمن عطا کی جس نے نوکری

پر جانے سے صرف میرے لئے انکار کر دیا۔ اور ———"

جیسے تنور میں سوکھی ہوئی لکڑیوں کا انبار جھونک دیا جائے تو دھوئیں اور آگ کا ایک فلک بوس ستون ابھر جاتا ہے' بالکل اسی طرح غونث کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔ "لیکن اسے تو صاحب نے نکال دیا تھا۔"

اور غلاموں بولا۔ "یہ تو تو کہہ رہا ہے نا ملک۔ آگے بھی تو سن۔ بولی جا کر اسے کہہ دے کہ میں اس عطا کی ہوں جس نے مجھے آنکھ کے نشے کی قیمض اور جارجٹ کا ———"

"لیکن" غونث بات کاٹ کر فریادوں بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن میں بھی تو اس کے لئے یہی کپڑا لایا ہوں۔" اور اس نے بغل میں دبائی ہوئی پوٹلی ہاتھ میں لے لی۔

"مگر ملک" غلاموں نے جیب سے کچھ نکالتے ہوئے کہا۔ "تو بعد میں آیا ہے۔ تو پرانا ہو چکا ہے اس کے لئے۔ تجھ پر دس مہینوں کی گرد جم چکی ہے نا ——— اور' لے یہ دس روپے۔ یہ میرا حق نہیں۔"

"یہ تیرا حق ہے۔ اسے اپنے پاس رکھ۔" غونث بولا۔ اور پھر پوٹلی بغل میں دبائے ہوئے ہولے ہولے گاؤں سے باہر نکل گیا۔ چپ چاپ۔ بھوت کی طرح۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا گیا۔ حیران غلاموں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اور پھر جب وہ دونوں گرجتے ہوئے نالے کے قریب پہنچے تو غونث بولا۔ "ایک بھاری پتھر لے آ غلاموں۔"

"کس لئے؟"

"تو لے تو آ۔" وہ غلاموں کو گھورتا ہوا بولا۔ اور جب غلاموں ایک بھاری پتھر اٹھا لایا۔ تو غونث نے آنکھ کا نشہ اور ہل جل اور جارجٹ کو پتھر پر لپیٹا۔ کلف لگے طرے کو پھاڑ کر کپڑوں کو پتھر پر کس کر باندھ دیا اور شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے اس گول مول گٹھڑی کو گھورا' اسے اٹھایا' سر پر گھمایا

اور پھر گرجتے ہوئے نالے میں دھم کی آواز آئی اور سینکڑوں بلبلے ابھر کر تیز رفتار لہروں پر دور بہہ گئے!

"یہ کیا ملک؟" غلاموں چلایا۔

"یہ میری جوانی کا جنازہ تھا۔" غونث بولا۔ اور پھر اس نے پچھی پہاڑیوں کا رخ کر لیا۔ غلاموں منہ کھولے وہیں نالے کے کنارے کھڑا اپنی آنکھ جھپکاتا رہا۔ اور غونث پہاڑیوں پر لڑکھڑاتا ہوا اسی جھرنے کے پاس آیا، اسی چٹان کے قریب بھیگی زمین پر بیٹھ گیا، اور پھر یونہی بھیگی مٹی کریدنے لگا!

دو چار لمحوں کے بعد وہ اچانک بھڑک کر پیچھے گر گیا۔ اس کی انگلیوں سے کوئی ٹھنڈی گول سی چیز مس ہوئی۔ "سانپ!" اور آس پاس تمام پہاڑیاں "فروا" "فروا" چیخ اٹھیں۔ "سانپ! سانپ!"

"نہیں۔ نہیں۔ میری بنسری!" غونث بولا۔ آگے بڑھ کر اس نے مٹی کو وحشیانہ طریقے سے کرید کرید کر دور پھینک دیا۔ اور پھر اس کے ہاتھ میں کالی بدنما بنسری کانپ رہی تھی۔ "میری بھولی بسری بنسری!" وہ بولا۔ اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ زبان کی نوک سے ہونٹوں کو تر کیا اور بنسری کو ان کے قریب لا کر سانس دی۔ بنسری سے ایک ہولناک سی پھنکار بلند ہوئی۔ اس میں سے گیلی مٹی کا ایک سانپ سا نکل کر جھرنے میں جا گرا اور پھر ذرہ ذرہ ہو کر تہہ پر بیٹھ گیا۔



پکا مکان

زمیندار جی کے پختہ اینٹوں کے محل کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یارُو نے راہ چلتے کسی سے سن لیا کہ زمیندار جی کے ہاں مزدوروں کی کمی ہے اور دوسرے دیہات سے نئے مزدور بلائے جا رہے ہیں۔ اس نے پرانے کمبل میں دو چیتھڑے لپیٹ کر گٹھڑی بنائی اور زمیندار کے گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ صرف چار آنے روز کی مزدوری دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے پرانے مزدور کام کرنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ پہلے تو اس کے دل کی منجمد ندی میں بھی بغاوت کا ایک ننھا سا بلبلہ اٹھا مگر اس نے ایک لمبی آہ سے اس بلبلے کو اڑا دیا اور زمیندار کے بڑے دروازے پر دستک دے دی۔

اس کے باپ نے ساری عمر جوا کھیلنے میں گنوا دی۔ زمینیں بک گئیں، مکان قرق ہو گئے۔ اس کی بوڑھی ماں تباہی نہ روک سکی۔ روتے روتے آنکھوں کی بصارت کھو بیٹھی اور جس روز اسے اپنے پختہ اینٹوں کے مکان سے باہر دھکیل کر نکالا گیا تو وہ دیوانی سی ہو گئی۔ بیٹھے بیٹھے منہ سے جھاگ برسنے لگتا اور تمام اعضا لوہے کی طرح تن جاتے اور کہیں دور ٹکٹکی باندھ کر کہتی۔ "اور کچھ بگاڑنا

ہے تو بگاڑ لے'   ٹھنڈی کر لے اپنی پیاس' مٹا لے اپنی بھوک' اگر تجھے کوئی اور انسان نہیں ملتا تو یارو کی ماں پہ بجلیاں برسا اور قہقہے مار کہ تو آسمان پر بیٹھا اس زمین کی ایک نحیف و نزار ہستی سے مذاق کر رہا ہے——" اور یہ کہہ کر وہ اس زور سے ہنستی کہ منڈیروں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں پھر سے اڑ جاتیں' پڑوسیوں کی مرغیاں کڑکڑانے لگتیں اور مسجد میں بیٹھے ہوئے مولوی جی تسبیح کے دانوں کو مٹھی میں مروڑ کر کہتے۔ "حد ہو گئی ہے۔ اس گاؤں پر عنقریب کوئٹے کا سا قہر ٹوٹے گا۔"——اور ایک روز تو تنگ آ کر انہوں نے بھری مسجد کے سامنے کہہ ڈالا۔ "یہ کتنی کفر بکتی ہے۔ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو اسے سولی پر چڑھا دیا جاتا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دینا چاہیے۔"

لیکن حقہ پانی بند کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ اس رات ایک تارے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی' اور جب یارو یہ کہتا ہوا اندر آیا کہ "ہمارے ٹکڑوں پر پلا ہوا بگلا اب ہم پر ہی آوازے کستا ہے۔" اور آگے بڑھ کر اپنی ماں کا شانہ ہلایا تو وہ ایک طرف گر گئی اور دھندلے دیے سے اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں چمکنے لگیں۔ آسمان والے کا مذاق اپنی تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

اس کا باپ اس سکی سے گھبرا کر کسی رات گھر سے نکل بھاگا۔ یارو اسے تھل کے ویرانوں تک ڈھونڈ آیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا اور اس کی ماں کی موت کے دس دن بعد اسے کندیاں سٹیشن سے اپنے دوست کرموں کا خط ملا کہ تمہارا باپ آج اسٹیشن کے جنگلے کے پاس مردہ پایا گیا ہے۔ اس کے منہ سے افیون کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

وہ کندیاں پہنچا اور باپ کی قبر کو جا کر چوما جو ایک ننھی سی ویران ڈھیری کی طرح زمین کی سطح سے تھوڑی سی ابھری ہوئی تھی اور جس پر دو کوے بیٹھے کائیں کائیں کر رہے تھے۔

کرموں نے اسے سمجھایا بجھایا کہ "یہیں اسٹیشن پر قلی بن جاؤ۔ روز

آٹھ دس آنے کما لو گے' مزے سے گزر ہو گی۔ یہیں شادی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ دو لڑکیاں میری نظر میں ہیں۔ وہ جو دو ننھے ننھے نیم کھڑے ہیں نا جوہڑ کے کنارے' بس ان کی طرح خوبصورت۔ نوخیز اور لچکیلی۔ تم دیکھو تو عمر بھر ان کی بکریاں چراتے رہو——رانجھے کی طرح۔"

مگر یارو کے دل پر کرموں کی ان ہلکی پھلکی باتوں نے کوئی اثر نہ چھوڑا۔ وہ اپنے گاؤں لوٹ آیا۔ گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر دو روپے جمع کر لئے اور ریوڑیوں بتاشوں کی دکان کھول لی۔ لیکن گاؤں میں نقد سودا اس طرح مشکل ہے جیسے تند آندھیوں میں دیا جلانا۔ ریوڑیاں بتاشے دو چار دنوں میں قرضہ کی صورت میں اس کے ہاتھوں سے نکل گئے اور صرف دو بوسیدہ چنگیریں اس کے پاس رہ گئیں۔ انہیں بیچ کر دو دن پیٹ بھرا۔ دو دن بھوکا رہا اور پھر ادھر زمیندار جی کے پختہ اینٹوں کے محل کی خبر سن لی۔

زمیندار جی کے بڑے دروازے پر دستک دیکر وہ بہت دیر تک کسی کی آمد کا منتظر کھڑا رہا۔ آخر آبنوسی رنگ کے ایک گرانڈیل حبشی نے کواڑ کھولے اور ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہے تو——کیا کام ہے؟"

"میں مزدوری کرنے آیا ہوں"——یارو نے یہ الفاظ یوں کہے جیسے وہ زمیندار جی کے سارے خاندان پر کوئی بہت بڑا احسان دھرنے آیا ہے۔

حبشی کے نتھنے پھول گئے جیسے اچانک سیاہ آسمان میں دو سوراخ پڑ گئے ہوں۔ پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "مزدوری کرنے آیا ہے! ——ارے سالے مزدوری کیلئے کیا زمیندار جی کی بیٹھک کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے! وہ سو رہے تھے۔ اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو قسم خدا کی' بوٹیاں نچوا لیتا ان کے کتوں سے۔ الو' واہیات' بیوقوف!"

یارو خاموش رہا کیونکہ   اب کواڑ بند ہو چکے   تھے اور اسے مزدوی کی ضرورت بھی تھی۔

نئے مکان کا پتہ پوچھتا کارندے کے پاس پہنچا' اور چار آنہ روز کی مزدوری پر پختہ اینٹیں اور گارا ڈھونے لگا۔

دو چار راتیں تو واپس گھر آ کر بسر کیں۔ لیکن ایک بار جب وہ تھکا ماندہ نئے محل کے قریب پہنچا تو ایک طرف سے زمیندار جی اٹھے اور بولے۔ ارے تو پوچھٹے کیوں نہیں آتا؟ اگر کل بھی اس وقت آیا تو گدی میں گھونسا جما کر دھکیل دوں گا۔ لفنگا کہیں کا۔ سولہ پیسے دیتے ہیں۔ بیگار تھوڑی لیتے ہیں!"

منجمد ندی میں چند ننھے ننھے بلبلے پھر ابھرے اور وہ بھول گیا کہ اس کا مکان بک چکا ہے اور اسکی خانماں بربادی دنیا کو معلوم ہے۔ بولا۔ "سب لوگ اسی وقت آتے ہیں۔"

زمیندار جی بپھر گئے۔ اپنی گھرکی کا جواب ——— چاہے وہ صحیح ہو یا غلط ——— انہیں ہمیشہ ناگوار گزرتا تھا۔ چلائے۔ "اور یہ سب تیرے باپ پھر رہے ہیں یہاں؟"

یارو کندھے جھٹکاتا پکی اینٹوں کے ڈھیر کی طرف چلا گیا۔ بلبلے زمیندار جی کی پھنکار سے اڑ گئے تھے۔

گاؤں سے باہر ایک ڈھیری پر ایک بوڑھے مزدور نے سرکنڈے کا ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ شام کو ادھر ہی کا رخ کیا۔ بوڑھے کی منت سماجت کی اور اب وہ اسی کے ہاں رہنے لگا۔

گاؤں کے کنوئیں کی طرف جانے والی پگڈنڈی اس جھونپڑے کے سامنے سے گزرتی تھی۔ دو کھٹولے جھونپڑے میں سماتے تھے۔ ایک پر بوڑھے کے چیتھڑے پڑے رہتے تھے اور دوسرے پر بوڑھا سونے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یارو کی آمد پر چیتھڑے ایک الگنی پر لٹکا دیے گئے۔ رات رات بھر بوڑھا کھانستا رہتا اور یارو سے عجیب عجیب باتیں کرتا۔

"یارو بیٹا۔ یہ مزدوری تمہیں نہیں سجتی۔ مرجاؤ یا یہاں سے چلے جاؤ

کیونکہ جب زمیندار اور اس کا کارندہ تمہیں گھرکتے ہیں' تو وہ ایک تمہاری توہین نہیں کرتے۔ دنیا کے سب جوانوں کے منہ پر تھوکتے ہیں۔ تم جوان ہو کر ذلیل لوگوں کے اشاروں پر اٹھتے بیٹھتے ہو۔ تف ہے تمہاری جوانی پر اور تف ہے تمہاری اس عقل پر جو غیرت کو دو کوڑیوں کے مول بیچ کر ذرہ بھر نہیں کھساتی۔"

"یارو بیٹا۔ شہروں میں جا کر مزدوری کرو۔ دیہات میں تو مزدور ایک حقیر کتے کی طرح ہے جسے کبھی کبھی تو وہ سب کچھ بھی اگل دینا پڑتا ہے جو اس نے در در پر دم ہلانے اور پاؤں چاٹنے سے حاصل کیا ہو۔ لو اب سو جاؤ۔ دیا بجھ چلا ہے!"

"یارو بیٹا۔ جانتے ہو زندگی کیا ہے؟ زندگی چند سانسوں سے بنی ہوئی ایک گیند ہے جو تقدیر کے شریر بچے کے ہاتھوں میں اچھلتی ہے' لڑھکتی ہے' ناچتی ہے اور جانتے ہو ہر گیند کی قسمت میں گھسنا اور پھٹنا لکھا ہے؟ اگر تم اس گیند کو تقدیر کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے بس میں کر لو تو تمہارا جینا سچا جینا ہے ورنہ کبھی یہ سانسوں کا تانا بانا تار تار ہو جائے گا اور تم نے شاید اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ تقدیر کے پاس صرف ایک گیند نہیں۔ لاتعداد کھلونے ہیں۔ کسی ایک گیند کا کھو جانا اسے کسی حالت میں بھی ناگوار نہیں گزر سکتا۔"

اور ایک رات تو بوڑھے نے چیختے ہوئے کھٹولے پر کروٹ بدل کر اور سامنے پیلے گارے سے لپی ہوئی دیوار پر پٹاخ سے بلغم کا ایک گولا مارتے ہوئے کہا۔ "یارو بیٹا۔ جتنا ہو سکے عورت ذات سے دامن بچائے رکھنا۔ یہ زہریلی ناگنیں ہوتی ہیں۔ انسان ان کی ملائم جلد اور مستانہ چال پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ یہ ڈنک بھی مار سکتی ہیں۔ میں نے ایک عورت کے ہاتھوں بہت دکھ سہے ہیں بیٹا ——— اور جانتے ہو وہ آج کل کہاں ہے؟ اسی علاقے کے ایک گاؤں کے ذیلدار کی ماں ہے۔ بدبخت روپے پیسے پر ریجھ گئی

اور ان راتوں کو بھول بیٹھی جن کی یاد آج تک اینٹوں کے بھٹے کے اس طرف پرانے شیشم کی گھنی چھاؤں میں سائیں سائیں کر رہی ہے ——— سن رہے ہو میری باتیں؟ ——— سو جاؤ۔ دیا بجھ چلا ہے۔"

دوسرے روز جب یارو منہ اندھیرے اٹھا اور چہرے پر ٹھنڈے پانی کا ایک چھینٹا مار کر جھونپڑے سے باہر قدم دھرا تو اچانک کسی چیز سے ٹکرایا۔ دھڑاک کی آواز آئی اور یارو کے سارے کپڑے بھیگ گئے۔ پڑوس کے کسی جھونپڑے میں ایک کتا آٹے کی مشین کی طرح بھونکتا ہوا اٹھا اور آواز کی تلاش میں دور نکل گیا۔ یارو اس ناگہانی حادثے کے متعلق ابھی تک سوچ ہی نہیں سکا تھا کہ آواز آئی۔ "اندھے ہو؟"

"نہیں" یارو نے جواب دیا۔ "اندھا تو نہیں ہوں البتہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ادھر سے کوئی اندھا گزر رہا ہے۔"

یہ کہہ کر یارو کے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ وہ کسی ہم پیشہ مزدور سے مخاطب نہ تھا۔ اس کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی جس کی باریک اور تیز آواز اس کے شباب کی غمازی کر رہی تھی۔ یارو نے اپنے کپڑوں کو ہولے ہولے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں شرمندہ ہوں۔"

"شرمندہ ہوں۔" آواز میں زہریلی طنز تھی۔ "گاگریں بھی پھوڑ ڈالیں اور اوپر سے آوازے بھی کستا ہے۔ لفنگا' آوارہ' واہیات۔"

عورت کی پرچھائیں تیزی سے بازو ہلاتی جھونپڑے کے اس طرف غائب ہو گئی اور اچانک یارو کو محسوس ہوا جیسے اسے کسی ناگن نے ڈس لیا ہے۔ ملائم جلد اور مستانہ چال والی ناگن۔ جس کے کاٹے کا منتر نہیں اور کاٹنا جس کی فطرت ہے اور ———

اور اندر بوڑھا کھانسا اور کھانسی کے جھٹکوں سے کھٹولے کی چولیں چرائیں اور چولوں کی چرچراہٹ سے چونک کر اندر سے چڑا اور چڑیا پھُر سے نکلے

اور اینٹوں کے بھٹے کی طرف اڑ گئے۔

سارا دن یہ خیال اس کے گرد آلود خیال کو کھرچتا رہا کہ وہ شوخ اور طرار لڑکی کون ہے اور میں اس سے کس درجہ اکھڑپنے سے پیش آیا ہوں ——— تھکا ماندہ اور کھویا کھویا پتلا گارا ڈھوتا رہا۔ ایک بار ٹھوکر کھا کر ٹوکری سمیت کارندے کی آرام کرسی کے قریب گر پڑا۔ اسکے کپڑوں پر گارے کی چھینٹیں جا پڑیں۔ اپنا سینہ اور ٹھوڑی زخمی کر بیٹھا۔ کارندے کی جھڑکیاں چپ چاپ سنتا رہا۔ سر لٹکائے جھونپڑے میں آیا تو بوڑھا ٹین کے پیالے میں بنفشہ بھگو رہا تھا۔ کھٹولے پر دھم سے گرا تو بوڑھے نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ ——— پریشان کیوں ہو؟ ———" اور پھر اسے خاموش پا کر بولا۔ "یارو بیٹا۔ لمبی عمر کا راز بے فکری اور بے پروائی ہے۔ وہ جو بڑے بڑے حادثوں کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں بہت مدت تک زندہ رہتے ہیں اور جو ذرا سے واقعہ کو قیامت سمجھ کر اپنا جی ہلکان کرتے رہتے ہیں۔ موت کو وقت سے پہلے دعوت دیتے ہیں۔ تم ———"

اور آج پہلی بار یارو نے بوڑھے کی بات کاٹی۔ "بابا تم نے کل ناگنوں کی بات چھیڑی تھی نا۔"

بوڑھا دیے کے چاروں طرف سے مردہ پروانوں کو نیچے گرا کر کھٹولے پر لیٹ گیا اور بولا۔ "کیوں خیر تو ہے؟"

اور یارو نے روحانی پریشانیوں کو ایک ہلکی سی کھسیانی مسکراہٹ کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔ البتہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا ناگنیں سدھائی نہیں جا سکتیں؟ کیا ان کے دانت نکال دیے جائیں تو وہ نقصان پہنچا سکتی ہیں؟"

کہنی کے بل ہو کر بوڑھا کچھ سوچنے لگا اور پھر مدھم آواز میں بولا۔ "لیکن بیٹا میں نے جن ناگنوں کی تم سے باتیں کی ہیں ان کے دانت نکالنا بھول گیا۔ مجھے تو ناگنوں نے کاٹا ہے۔ پالتو ناگنوں نے کاٹا ہے۔ مجھے ناگنوں کے

سدھانے کے گر نہیں آتے ـــــــ لو اب سو جاؤ۔ تیل بھی ختم ہو چلا ہے دیئے میں۔ لو چپکنے لگی ہے۔"

اس روز وہ شام کو گھر واپس آ رہا تھا۔ بڑھتے ہوئے دھندلکے میں تیزی سے اڑتے ہوئے پرندوں کے سائے یکے بعد دیگر تیر کی طرح اس کے سر پر سے سائیں سائیں کرتے گزر جاتے تھے اور گنجان نیموں کی ٹہنیاں پھدکتی اور چہچہاتی ہوئی چڑیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ مٹتی ہوئی روشنی اور ابھرتے ہوئے اندھیرے نے اس کی روح میں ایک پھریری سی دوڑا دی۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ اس گاؤں میں صرف ناگنوں کو سدھانے آیا ہے۔ لپکتی ہوئی پرچھائیوں کے ہیولے اس کے ذہن پر ابھرتے اور تیز تیز قدم اٹھاتے پورب سے اٹھتی ہوئی ظلمتوں میں کھو جاتے۔ راہ کی دونوں طرف اگی ہوئی گنجان جھاڑیوں میں چیختے ہوئے ٹڈے اسے بہت پیارے معلوم ہونے لگے جو اندھیرے میں بیٹھے اپنے من پر چار رہے تھے۔ اور پاس ہی کنوئیں میں لٹکے ہوئے ٹین کے ڈولوں کی کھڑکھڑاہٹوں میں اسے کوئی ایسا زندگی بخش نغمہ سنائی دینے لگا جس کے زیر و بم پر بوڑھے وقت کے قدم اٹھتے ہیں ـــــــ اس نے اچانک دن بھر کی تھکن اور اس طویل بے معنی سوچ کی وجہ سے پیاس محسوس کی اور اسی دھن میں کنوئیں کا رخ کر لیا۔ تین لڑکیاں سروں اور کولہو پر گاگریں رکھے جانے ہی والی تھیں کہ وہ کنوئیں کے بلند چبوترے پر چڑھتا ہوا بولا۔ "ہو سکے تو چلو بھر پانی پلا دو۔"

ایک بولی۔ "خود نکال لے۔"

اس نے مسکین لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میرے پاس رسی اور ڈول نہیں۔"

دوسری نے گاگر کو سر پر پھراتے ہوئے کہا۔ "تو لٹک جا نیچے۔ اتنا بڑا مسٹنڈا ہے۔ اللہ قسم تو ہاتھ لٹکائے تو پاتال کی خبر لے آئے۔" اور پھر تینوں نے

زور زور سے قہقہے لگائے اور گاگریں سنبھالتی مٹکتی ہوئی چل دیں اور پھر ان میں سے ایک پلٹی اور بولی۔ "لیکن تو کہاں کا رہنے والا ہے؟"

وہ بڑبڑایا۔ "پردیسی ہوں یہاں مزدوری کرتا ہوں زمیندار جی کے پکے مکان پر۔"

لڑکی ایک قدم آگے بڑھا کر بولی۔ "اور تو رہتا کہاں ہے؟"

"ادھر راستے پر جو پہلا جھونپڑا پڑتا ہے نا وہاں۔"

اور لڑکی تن کو بولی۔ "کل شام کو کیا آنکھیں نکلوا ڈالی تھیں کہ میری گاگروں کا ستیاناس کر دیا اور اب پانی پینے آیا ہے۔ دوپہر سے ڈول لٹکا لٹکا کر اور رسیاں کھینچ کھینچ کر جو دو گھونٹ جمع کئے ہیں وہ تجھے پلا دیں اور خود بابا کے جوتے کھائیں ـــــــ آ جاتے ہیں وہاں سے مزدوریاں کرنے موئے کنگلے کہیں کے!"

یارو کے گلے سے جیسے ناگنیں لپٹ گئی ہیں۔ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "گاگر کے پیسے لے لے مجھ سے اور اتنے بڑے بول نہ بول کہ میں پردیسی ہوں اور تو نوجوان لڑکی ہے ـــــــ ورنہ اگر میرا بھی یہی گاؤں ہوتا اور کوئی لڑکی مجھ سے اس طرح باتیں کرتی تو یوں چٹکی میں دبا کر مسل ڈالتا ـــــــ!" اور یارو نے دن بھر کی مزدوری اپنی جیب سے نکالی اور اس کے قدموں میں پھینک کر پتھریلے رستے پر ٹنکر اڑاتا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اور جب دیا بجھ گیا اور بوڑھے کے حلق میں بلغم چیخنے لگا تو کروٹیں بدلتے بدلتے اس کے شانے چھل گئے۔ وہ حیران تھا کہ اسے نیند کیوں نہیں آتی اور اس کے تصورات پر کنوئیں کا چبوترہ ایک پتلے سائے سمیت ابھر کر کہاں غائب ہو جاتا ہے!

آدھی رات کو اس نے جھونپڑے کے باہر کسی کی دیوار سے لگ کر ہولے ہولے چلنے کی آواز سنی۔ آواز جھونپڑے کے دروازے پر آ کر رک گئی

اور بہت دیر تک خاموشی طاری رہی۔ وہ چپکے سے کھٹولے سے اتر کر دروازے تک آیا۔ خاموشی سے دروازہ کھولا اور ادھر ادھر بھیانک اندھیرے میں آنکھیں جھپکانے لگا کہ اچانک اس کے شانے کو کسی نے چھوا اور پتلی سی آواز آئی "لے ۔۔۔۔۔۔ وہ دونیاں اس کی مٹھی میں گھسیڑ دی گئیں ۔۔۔۔۔۔ اور قبل اس کے کہ وہ اپنی زبان ہلا سکتا ایک پتلی سی پرچھائیں جھونپڑے کے اس طرف لپک کر غائب ہو گئی! اور اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس نے ایک زہریلی ناگن کے دانت نکال لئے ہیں!

اس دن سے وہ گلی میں گزرنے والی ہر لڑکی کو گھور کر دیکھنے لگا۔ دراصل شام اور پوپھٹنے کے دھندلکوں میں لپٹے ہوئے چہرے کو وہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا اور اس کی زبردست خواہش تھی کہ ایک بار اسے اچھی طرح دیکھے۔ گاؤں میں اس نوجوان پردیسی مزدور کی دیدہ دلیری کے تذکرے ہونے لگے اور ایک روز چوپال پر ایک بوڑھے نے یہاں تک کہہ ڈالا۔ "اگر یہی حالت رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ لفنگا کسی کی ناک کاٹ کر ہوا ہو جائے گا اور پھر ہم سب ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس کا بندوبست کرنا چاہیے۔"

اور زمیندار جی اپنے عصا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "میں انتظام کر لوں گا۔"

اسی روز زمیندار جی کے پکے مکان کی چھت ڈالی جانے والی تھی۔ وہ صبح سویرے اٹھا اور جب کنوئیں کے قریب سے گزرا تو پتھریلی راہ پر اسے ایک لڑکی نظر آئی گاگریں اٹھائے ہوئے۔ ایک جھکی ہوئی بیری کے تنے کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اسے گھورتا ہوا اس کے قریب سے گزرا تو اس کی جی میں کسی احساس نے سرگوشی کی۔ "ارے یہاں ٹھٹک کر کھڑا ہو جا اور اس سے پوچھ لے کہ کیا تم ہی تو وہ لڑکی نہیں ہو جس نے مجھے اس روز کنوئیں پر دو چھوکریوں کے سامنے جھڑک دیا تھا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہاری باتوں کا برا مانا ہے۔

ہرگز نہیں۔ یہ شک تمہیں کیسے گزرا! میں تو حیران ہوں کہ تمہیں یہاں چھوڑ کر اپنے گاؤں کیسے جاؤں گا۔ یوں کرو کہ مجھے صبح شام کا کھانا دے دیا کرو میں تمہارے لئے بغیر کسی اجرت کے پانی بھرتا رہوں گا" ۔۔۔۔۔۔ اور انہی خیالات کے زیر اثر وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور جب اس کے دماغ کے ریگزاروں میں مختلف تصورات کے بگولے چیختے ہوئے گزرنے لگے تو اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"اچھا تم ہو۔" یارو آگے بڑھ کر بولا۔

"دیکھو۔" وہ کمر پر گاگر کو اچھی طرح جماتے ہوئے بولی۔ "تم نے گاؤں والوں کی باتیں سن لی ہوں گی۔ عجب نہیں کہ کوئی کمبخت تمہیں دن دہاڑے پیٹ ڈالے۔ تم پردیسی ہو اور گو میں تمہیں اتنا اچھا تو نہیں سمجھتی کیونکہ تم نے میری گاگریں توڑ ڈالی تھیں اور اس روز کنوئیں پر تم نے خوب ٹھٹھے پھڑکائے تھے' لیکن میں تمہیں بے عزت ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ پچھلے چند دنوں سے تم لڑکیوں کو پاگلوں کی طرح کیوں گھورنے لگے ہو؟" اور اس نے کولہے سے گاگر اتار کر بیری کے تنے سے لگا دی۔

پوپھٹ چکی تھی اور چیلوں اور کوؤں کے غول ویرانوں سے گاؤں کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ دور بلندی پر گاؤں کی بڑی گلی پر سے چند پنہاریاں اتر رہی تھیں۔ یارو نے خشک گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ اس روز شام کے اندھیرے میں میں تمہیں اچھی طرح نہ دیکھ سکا تھا۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ تمہیں ڈھونڈ نکالوں۔ مجھے صرف تمہاری تلاش تھی ۔۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا میں تمہیں پہچان لوں گا۔"

اور وہ بولی۔ "لیکن تم مجھے نہیں پہچان سکے۔ کیونکہ کئی بار گلی میں تم نے مجھے بھی گھورا لیکن منہ کھولے آنکھیں جھپکاتے تم آگے نکل گئے۔ تم بہت بھولے ہو' خیر اب یہاں سے بھاگ نکلو کیونکہ سنا ہے زمیندار جی بھی تم پر غصے

ہو رہے تھے۔"

یارو نے بدحواس ہو کر پوچھا۔ "لیکن تم ——"

"میں یہیں رہوں گی۔" وہ بولی۔ "میں یہیں کی رہنے والی ہوں۔"

اور اس نے پھر پوچھا۔ "لیکن میں ——"

"تم پردیسی ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن —— لیکن مجھے تم سے انس ہو گیا ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنا روحانی طوفان چند الفاظ کے ذریعے اگل ڈالا۔

لڑکی نے گاگر اٹھالی اور بولی۔ "بہت اچھی بات ہے۔ لیکن تم مجھے چاہنے کی دھن میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر تمہارا یہی گاؤں ہوتا' یہیں مکان ہوتا تو تم مجھے شوق سے چاہ سکتے تھے کیونکہ چاہت بری بات نہیں۔ لیکن اب ایسا مشکل ہے۔ البتہ میں تمہیں یاد رکھوں گی کیونکہ تم بہت سادے اور غصیلے نوجوان ہو۔"

یارو کا جسم تپ رہا تھا۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ بولا "لیکن اگر ایک روز میں یہیں آ کر پختہ اینٹوں کا ایک مکان بنوا لوں پھر؟ ——"

اور وہ مسکرا کر بولی۔ "جس روز تم نے یہاں پکا مکان تیار کرا لیا اور جس روز اس مکان کی چھت ڈالی گئی میں شام کے بعد اندھیرا ہوتے ہی تم سے ملنے اور تمہارے نئے مکان میں دیا جلانے آؤں گی۔" اور وہ تیزی سے پتھریلی پگڈنڈی پر لہراتی ہوئی نکل گئی۔ اور وہ وہیں سے اپنے جھونپڑے کی طرف واپس مڑ پڑا اور بوڑھے سے اجازت چاہی۔ بوڑھا بولا۔ "میں خود تمہیں یہاں سے چلے جانے کو کہہ دیتا مگر مجھے خوف تھا کہ تمہارے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ دل بہت نازک چیز ہے بیٹا' اور جب اس کو ذرا سی ٹھیس بھی لگ جائے تو چکنا چور ہو جاتا ہے۔ میں اپنے سینے میں دل کے آبگینے کی کرچیاں اٹھائے پھرتا ہوں اور آج تک

اسے کوئی شیشہ ساز نہیں جوڑ سکا —— اچھا خدا حافظ۔" یارو وہاں سے چلا آیا اور ایک بڑے شہر میں آ کر مٹھائی کی ایک ننھی سی دکان کھول لی۔ کچھ دنوں ہی میں اس کی دکان چمک اٹھی اور چند مہینوں میں اس نے پختہ اینٹوں کا ایک ننھا سا مکان بنانے کا خاصا سرمایہ جمع کر لیا۔

وہ یہ سب کچھ ایک لطیف اور شدید جذبے کے تحت کرتا رہا۔ ایک روز شام کے وقت وہ اسی گاؤں میں واپس آیا اور بوڑھے سے مل کر اسے سارا حال سنایا۔ بوڑھے نے کہا۔ "میں کب سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ کوئی عزیز نہیں۔ تمہارے ساتھ میں نے چند دن اچھے کاٹے ہیں اور گو یہ جھونپڑا سارے گاؤں سے الگ ایک ڈھیری پر کھڑا ہے لیکن اگر تم یہاں مکان بنوا لو تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مگر دیکھو۔ کچی اینٹوں کا مکان نہ بنانا۔ کیونکہ آج کل لوگ کچی اور پکی اینٹوں کے ترازو میں انسان کی عزت اور آبرو کو تولتے ہیں۔ جونہی تم نے پکی اینٹیں منگانا شروع کیں لوگ تمہاری طرف جھک جائیں گے۔ بھری ہوئی جیب ہی آج کل عزت ناموس کی کنجی ہے۔"

اور جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ بدمعاش مزدور شہر میں جا کر بہت کچھ کما لایا ہے اور وہ پکی اینٹوں کا ایک مکان بنانے کی فکر میں ہے تو اس کے ارد گرد اچھے اچھے سفید ریشوں کا جمگھٹ رہنے لگا۔ لیکن زمیندار جی بڑبڑاتے رہے اور ایک روز بولے۔ "کہیں سے چوری کر لایا ہو گا۔ ورنہ پختہ اینٹوں کا مکان میرے بغیر کون تیار کرا سکتا ہے' گاؤں کے سردار کا مقابلہ کرتا ہے —— قسم خدا کی کسی روز ایسا ہاتھ دکھاؤں گا کہ یاد رکھے گا مرتے دم تک۔"

ادھر دیواریں اٹھنے لگیں اور خستہ و پامال جھونپڑے کی جگہ ایک پکے مکان نے لے لی۔ اس تمام عرصے میں اس کے دل کی خلوتوں میں یہ خیال ٹیس بن کر اٹھتا کہ کہیں وہ اپنا وعدہ بھول ہی نہ چکی ہو' اور یہ پختہ اینٹوں کا محل ویران ہی نہ رہ جائے۔ لیکن اکثر گاؤں کی بڑی گلی کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر وہ

بہت دور نشیب میں کنوئیں کے اس طرف جھکی ہوئی بیری کو جا کر دیکھ آتا اور گزرے ہوئے دنوں کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی آتیں اور اس کے دل پر اطمینان کی پھواریں برسا کر فضاؤں میں تحلیل ہو جاتیں۔

ایک روز اس کے کانوں میں یہ اڑتی ہوئی خبر پہنچی کہ زمیندار جی کی بیٹھک سے سریا چوری ہو گیا ہے اور انہوں نے تھانے جا کر رپورٹ کر دی ہے۔ لپک کر اپنے سریے کو دیکھا جو ایک کونے میں محفوظ رکھا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب اس کے مکان پر چھت ڈالی جانے والی تھی۔ آن کی آن میں شہتیر جمائے گئے' مٹی ڈالی گئی اور شام سے بہت پہلے مولوی جی نے اس کے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ "اے الہ العٰلمین! یہ مکان حلال کی کمائی سے تیار ہوا ہے۔ اسے اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھ اور اس میں بسنے والوں پر اپنا کرم برسا کہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا اور مہربان ہے۔"

جب وہ سب لوگوں کو رخصت کر چکا اور بوڑھا اسے دعائیں دیتا کسی دوست کے ہاں چلا گیا تو اس نے اندر جا کر رنگین پلنگ پر بستر بچھایا۔ ریشمی چادر پھیلائی اور اس کے پائے کا سہارا لے کر نیچے گیلے فرش پر یوں دم سادھ کر بیٹھ گیا جیسے ابھی چند لمحوں میں اسے کائنات کے کروٹ بدلنے کا انتظار ہے۔

ایک بار دور سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ دروازے تک آیا اور ابھی وہ چاروں طرف اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا کہ بہت سے مضبوط ہاتھ اس کی گردن اور بانہوں پر پڑے اور جب اس نے اپنے حواس مجتمع کئے تو اس نے دیکھا کہ اس کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں چھنچھنا رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" وہ چیخا۔

اور پولیس کا ایک افسر بولا۔ "تم نے زمیندار جی کا سریا چرایا ہے اور حوالات کی سلاخوں میں بند ہو کر تمہیں سب باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔ تیز قدم اٹھاؤ۔" اور یارو کی پسلیوں میں پولیس افسر نے ایک بہت سخت ٹھوکا دیا۔

اور جب اس نے پلٹ کر اپنے مکان کی طرف دیکھا تو برآمدے میں اسے ایک پرچھائیں دیا سلائی روشن کرتی نظر آئی۔ ایک مدھم سا دیا جل اٹھا۔ پرچھائیں اندر چلی گئی اور باہر آ کر کہیں دیکھنے لگی!

"کدھر دیکھ رہے ہو؟" پولیس افسر نے ہتھکڑیاں کھینچیں۔ وہ چٹان پر منہ کے بل گرا اور بولا۔ "اپنے پکے مکان کی طرف۔"

سب لوگ کرخت قہقہے لگاتے ہوئے اسے کھینچ کر آگے جانے لگے!

ایک بولا۔ "لیکن یہ یارو کے مکان میں کون تھا۔"

"کوئی کنیا ودتیا ہو گی۔" پولیس افسر بولا۔

اور ٹھنڈی ہتھکڑیاں یارو کو اپنی کلائیوں پر ناگنوں کی طرح لپٹی ہوئی معلوم ہوئیں۔



چھاگل

کھیت کے کنارے ادھیڑ عمر شریف ایک ننھے سے پتھر کو ایک بڑی چٹان سے بجا رہا تھا اور کھیت کے قریب ابھری ہوئی ڈھیری کی گول چوٹی پر بھیڑیں چر رہی تھیں۔ آسمان پر دو بادل اونٹوں کی شکل اختیار کر کے افق کی طرف بھاگے جا رہے تھے' اور دور نیم کے ایک گنجان درخت کے نیچے کوئی چرواہا بیٹھا مرلی بجا رہا تھا۔ مرلی کے تیز سر فضا کے لامحدود خلاؤں میں تیز پر بھونروں کی طرح تیرتے پھر رہے تھے اور شریف کے پتھر کی ٹھک ٹھک جیسے اس ابدی نغمے کے لئے تال کا کام دے رہی تھی۔

اچانک پتھروں میں سے دو چنگاریاں نکل کر بجھ گئیں اور شریف کا ہاتھ رک گیا۔ مرلی کے تیز سر اس کے کانوں کے قریب پھڑپھڑانے لگے اور اس نے پلٹ کر مرلی بجانے والے کی طرف دیکھا۔ ڈھیلے ہونٹوں میں تناؤ پیدا ہوا' بے رنگ جبڑے نمایاں ہوئے' جھولتے ہوئے پیلے دانت دکھائی دیئے' اس کی ننھی ننھی دھندلی آنکھوں میں اک مبہم سی چمک آئی' وہ مسکرانے لگا۔ اس کے سینے میں مہین دھول کی تہوں کے نیچے سے ایک خیال نے سر نکالا اور اچھل کر اس کے دماغ میں آ بیٹھا۔ شریف سوچنے لگا۔ "مرلی بجانے والے' تو مرلی میں اپنے من کی آگ پھونک رہا ہے اور میں اس آگ کی لپٹیں محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تو جوان ہے' جوانی آگ ہے' اور آگ کا کام شعلے بھڑکانا ہے۔ میں بوڑھا ہوں' بڑھاپا پتھر ہے۔ لیکن آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا

ہے' کہ پتھر چنگاریاں بھی اگل سکتے ہیں! کیا میرے سینے کی راکھ میں ابھی تک کوئی انگارہ دبا پڑا ہے!" اور اس نے اپنے سینے کو ٹٹولا۔ ابھری ہوئی ہڈیوں نے جیسے اس کی انگلیوں کو ڈس لیا! اس نے ایک بار پھر ننھے سے پتھر کو چٹان سے ٹکرایا اور چند چنگاریاں چمک کر بجھ گئیں۔ اس نے پتھر کو ہوا میں اچھال دیا جو نیچے گر کر لڑھکا اور ایک نودمیدہ پودے کی جڑ کے پاس رک گیا۔ پودے کا سارا وجود کپکپا کر پھر سیدھا ہو گیا—— شریف اٹھا۔ انگڑائی لے کر اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں اور اوپر نیلے آسمان پر ان دو بادلوں کو دیکھنے لگا جو پردہ نشین لڑکیوں کی شکل اختیار کر کے جیسے پر سکون سمندر پر تھرکتی جا رہی تھیں!——

"سب جھوٹ! سب غلط۔ سب بکواس!"—— اور سینے کو یوں سختی سے ملا' جیسے اس نے اس کے اندر دبکے ہوئے تمام خیالات کو مسل ڈالا ہے۔

ہولے ہولے وہ ڈھیری پر چڑھنے لگا۔ ایک جھاڑی کے سائے میں سے چھاگل اٹھائی کہ پانی پی لے مگر اچانک اسے الٹ دیا۔ "باسی پانی!" وہ بولا۔ خالی چھاگل ہاتھ میں لٹکا کر وہ ڈھیری کے گرد گھومتی ہوئی پگڈنڈی پر سے ہوتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ آسمان پر بادل ناپید ہو گئے' مرلی رک گئی اور ایک شکرا بندوق کی گولی کی سی آواز پیدا کرتا ایک کبوتر کے تعاقب میں ڈھیریوں سے ورے غائب ہو گیا۔

شریف چھاگل بھر کر واپس آیا' تو اس کا دماغ بالکل خالی تھا۔ جھاڑی کے قریب ایک بہت بڑے پتھر کو لڑھکا لایا۔ اس پر چادر رکھی اور ایک بار بھیڑوں کی طرف دیکھ کر پتھر پر سر رکھ' کر آنکھیں بند کر لیں۔

دھوپ کی وجہ سے اسے اپنے پتلے پتلے پپوٹوں سے پرے پیلا پیلا اندھیرا نظر آیا اور پھر اس اندھیرے میں لہریں اٹھنے لگیں۔ اندھیرا رنگ بدلنے لگا۔ سبزی مائل پس منظر پر اچانک بہت سے ہیولے ابھرے' جن کے خطوط گو واضح نہ تھے لیکن شریف کا جی چاہا کہ یہ ہیولے ان بل کھاتی ہوئی لہروں سے

نکل کر اس کے قریب آ جائیں اور اس آرزو کے پیدا ہوتے ہی ان بے شمار ہیولوں میں سے ایک پرچھائیں سی آگے بڑھی اور اس کے بہت قریب آ گئی۔

"فاطمہ!" وہ پکارا۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ پاس ہی چرتی ہوئی بھیڑیں ڈھیری کی طرف دوڑ گئیں اور ارد گرد پہاڑیوں نے بیک وقت "فاطمہ!" کی گونج پیدا کر دی۔ شریف کا چہرہ برسوں کے سوکھے ہوئے چمڑے کی طرح بے نور ہو گیا۔ ڈھیلے ہونٹ کانپنے لگے' اور آنکھوں کے سامنے پیلے اور سبز تارے ناچنے لگے۔ چند لمحے وہ دھوپ سے تپے ہوئے خلا میں گھورتا رہا اور پھر سر کو چادر پر اچھی طرح جما کر آنکھیں بند کر لیں مگر فوراً" کھول دیں اور پیٹھ کے نیچے سے پتھر نکال کر پرے پھینک دیا! ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ لیکن اب اس پیلے اندھیرے کی بیکراں وسعتوں میں نہ لہریں اٹھیں نہ بے شمار ہیولے ابھرے۔ صرف فاطمہ اشکوں بھری پلکوں کو جھپکاتی اس کے اس قدر قریب آ گئی کہ شریف نے اس کی گرم گرم سانسیں اپنے ماتھے سے مس کرتی محسوس کیں۔ شریف کے جسم کے ہر ذرے سے بے ربط سی دھڑکنیں بلند ہونے لگیں' اور پھر فاطمہ کے نیلے ہونٹ وا ہوئے اور وہ بولی۔ "تو نے میری امیدوں کی پکی ہوئی کھیتی کو جلایا! تو نے میرے حسن کے نوخیز پھول مسلے! تو نے مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کیں! مجھے یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے میری روح میں کوئی ان دیکھا ہاتھ شہد کی بوندیں ٹپکا رہا ہے! لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شہد کے ان قطروں میں میری جوانی کا زہر چھپا ہوا تھا۔ تو نے میرا نام لے کر گلی گلی اپنی فانی محبت کے گیت گائے۔ تو نے مجھے گھر گھر بدنام کیا۔ ان دنوں مجھے اس بدنامی پر ناز تھا لیکن تو مجھے چھوڑ کر پولیس میں بھرتی ہو گیا' اور یہی بدنامی میری روح کا گھن بن گئی! تو بے وفا ہے' تو فریبی ہے' تو کمینہ ہے۔ تجھے انسان سمجھنے والے حیوان ہیں! تجھے زندہ سمجھنے والے مردہ دماغ ہیں۔ تو حیوان ہے' تو مر چکا ہے۔ اس دن سے مر چکا ہے جب تو سر پر لمبا طرہ رکھ کر اور کھڑکھڑاتے ہوئے

لٹھے کی چادر باندھ کر لاہور چلا گیا تھا۔ بدقماش' جب تو چھٹی پر واپس آیا اور تجھے معلوم ہوا کہ میں نے اپنے باپ کی افیون چرا کر کھالی تھی اور تیرے جانے کے ہفتہ بھر بعد قبر میں جا سوئی تھی تو تیری آنکھوں سے ایک آنسو تک نہ ٹپکا۔ تو میری قبر پر بھی نہ آیا۔ تو نے صرف ایک دوست سے میرا ذکر کیا اور اس سے بھی صرف اتنا کہا۔ "اس گاؤں کی لڑکیوں کے پاس نہ فاطمہ جیسی چکنی پنڈلیاں ہیں نہ ریشمی گال!" —— تف ہے تجھ پر۔ تف ہے! تف ہے!" —— اور شریف نے محسوس کیا جیسے فاطمہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ غصے میں بیتاب ہو کر وہ فاطمہ پر جھپٹا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک بھیڑ اس کے منہ سے منہ لگائے کھڑی تھی' اور جب شریف نے اس کے پیٹ پر ایک گھونسا مارنا چاہا تو وہ اس زور سے چھینکی کہ شریف دیر تک اپنا جھریوں بھرا چہرہ پونچھتا رہا۔

اس کا دماغ انگارہ بن گیا اور اس انگارے کی حدت سے اس کی نس نس تانبے کے باریک تاروں کی طرح تپ گئی۔ ہر پہاڑی کی چوٹی پر اسے فاطمہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر پھنکاریں بھیجتی نظر آئی۔ اس تکلیف دہ خیال کو دل سے نکالنے کے لئے وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ قہقہوں سے تنگ کھاڑیاں گونج اٹھیں اور ساری کائنات کو اس خوشی میں شامل دیکھ کر اسے آس پاس ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر پانی چھڑکا جا رہا ہو۔ "اونہہ" اس کے سینے کی راکھ سے ایک اور خیال اچھلا "محبت اٹھائے پھرتی ہے۔ لطف تو تب تھا کہ تو میرے پیچھے پیچھے لاہور چلی آتی' یہاں افیون کھا کر مر گئی تو کونسا تیر مارا" —— اور یہ خیال پھر اسی راکھ میں دبک گیا۔ اسے ہر طرف پتھر کی ٹھک ٹھک سنائی دینے لگی اور اس نے جھٹ اپنے دونوں خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ پھر دور گنجان نیم کی طرف اور اس کی نظریں نیم کے پاس ابھرتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن پر سے ہوتی' اسی جگہ آ کر رک گئیں جہاں وہ خود پتھر بجاتا رہا۔ ایک لڑکی سر جھکائے اسی چٹان پر پتھر بجا رہی تھی۔

وہ جان بوجھ کر زور سے کھانسا۔ لڑکی کا ہاتھ رک گیا اور اس نے پلٹ کر شریف کی طرف دیکھا۔ دو نشوں بھری آنکھیں اوپر فضا میں اٹھ کر شریف کے سامنے آگئیں اور ان کی صاف پتلیوں میں اسے اپنا عکس نظر آنے لگا۔ وہ ایک بار جھپکیں اور کھلیں اور شریف کا دل سمٹا اور پھیل گیا۔ پھیلتا گیا۔ پھیلتا گیا حتیٰ کہ وہ لڑکی اس کے دل کی زد میں آگئی۔ شریف نے ایک بار کھنکار کر ان پرچھائیوں کو پرے پھینک دیا اور چٹان کی طرف دیکھا تو ٹھک ٹھک اسی طرح جاری تھی۔

نہایت آہستہ آہستہ وہ ڈھیری سے اتر کر چٹان کے قریب پہنچ گیا اور جب لڑکی نے ایک بار پھر اس جھاڑی کی طرف دیکھا جہاں شریف لیٹا ہوا تھا تو شریف کو وہاں نہ پا کر اس نے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ شریف مسکرایا۔ بے رنگ جبڑوں میں لٹکے ہوئے پیلے پیلے دانتوں پر دھوپ نے ایک آسیبی سی چمک پیدا کر دی۔ "تم کس کی لڑکی ہو؟" وہ اپنی بھاری آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

لڑکی نے پتھر کو ہاتھ میں گھمایا اور بولی۔ "تم میرے باپ کو نہیں جانتے۔ میں یہاں کی رہنے والی نہیں' میرا وطن میدانوں میں ہے۔ ہم یہاں بیل چرانے آئے ہیں کیونکہ ہمارے وطن میں آج کل قحط پڑا ہوا ہے۔"

"بیل کہاں ہیں تمہارے؟" شریف نے اس کے خمیدہ لبوں کے گوشوں کی پھڑکن دیکھنے کے لئے سوال پوچھا۔

اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "بیل تو ان ڈھیریوں کے پرے چر رہے ہیں۔ میں پانی کی تلاش میں ادھر آئی تھی مگر مجھے تو یہاں کوئی چشمہ' کوئی جھرنا نظر نہیں آیا۔ یہاں سامنے درے سے ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے اس لئے میں نے کہا۔ چلو ٹھنڈا پانی نہیں' ٹھنڈی ہوا ہی سہی۔ ہمیں پیاس بجھانے سے کام ہے۔"

"ٹھیک ہے" شریف بولا۔ "لیکن ہوا سے پیاس بجھ سکتی تو خدا پانی پیدا ہی کیوں کرتا۔"

"جی بہلاوا سمجھ لو۔" وہ مسکرائی اور اس کے موتیوں کے سے دانتوں پر دھوپ نے ایک آسمانی چمک پیدا کر دی۔

شریف کے سینے کی راکھ میں سے بہت سے خیالات نکل کر خانہ بدوش بونوں کی طرح ناچنے لگے اور وہ اپنے استخوانی ہاتھ کو سینے پر مل کر بولا۔ "لیکن اگر تمہیں پانی مل جائے؟"

"تو خدا کا شکر ادا کروں گی۔"

"اور میرا؟" شریف کے دماغ میں ایک خیال اچھل کر چلّایا۔ بہت مشکل سے اس نے اپنے دماغ کی باغی سپاہ کی روک تھام کی اور بولا۔ "تو چلو میرے ساتھ' وہ سامنے جھاڑی تلے چھاگل دھری ہے' ابھی ابھی بھر کر لایا ہوں۔"

وہ آہستہ آہستہ ڈھیری کی طرف چلنے لگا۔ پلٹ کے پیچھے دیکھا تو لڑکی سر جھکائے آ رہی تھی اور ہوا کی وجہ سے اس کے بال اس کے چہرے پر بکھر بکھر جاتے تھے۔ شریف نے سوچا کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں ڈھیری کی طرف جانے میں اس قدر تیزی نہ کرتا۔ وہ آگے چلتی' میں اس کے پیچھے پیچھے ہوتا اور دیکھتا کہ اس کے پاؤں کیسے اٹھتے ہیں' اس کا آنچل کیسے پھڑ پھڑا کر اس کے سر سے اڑ جاتا ہے اور اس کے بال کس طرح ہوا میں ایک جالا سا بن کر اس کے شانوں پر بکھر جاتے ہیں ۔۔۔۔ اس کے ہاتھ' اس کی پیٹھ' اور شاید اس کی پنڈلیاں بھی! ۔۔۔۔ پنڈلیوں کا خیال آتے ہی اسے فاطمہ یاد آگئی اور وہ اس قدر پریشان ہو گیا کہ سر کو جھٹک جھٹک کر بڑی مشکل سے یہ پرچھائیں باہر نکالی۔

اسے سر جھٹکتا دیکھ کر لڑکی بولی۔ "تمہارے سر میں درد ہے شاید؟"

اور شریف کے جسم کا ذرہ ذرہ مسکرانے لگا۔ "ہاں ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے درد ہو رہا ہے"

"ہوا سے بچ کر دھوپ سینکو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔" وہ بولی۔

اور شریف کے دماغ میں کسی نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "لیکن کیا تم میرے سر کو نہیں دباؤ گی؟ میری عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے اور تم پندرہ سولہ سال کی معصوم لڑکی ہو۔ تمہیں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں ـــــ" لیکن اب شریف جھاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ لڑکی کو بہت دیر تک روکے رکھے لیکن اس وقت چھاگل اٹھانے کے سوا اسے اور کوئی بات نہ سوجھی۔

چھاگل اٹھا کر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور ایک ہی نظر میں اس کے سب خدوخال کا جائزہ لے لیا۔ اس مختصر وقفے میں اس نے سوچا۔ "اس کے بال یوں تو عام لڑکیوں کی طرح ہیں۔ لیکن انہیں ہوا نے اس کے چہرے پر بکھیر کر غضب ڈھایا ہے۔ آنکھیں بہت غیر معمولی طور پر خوبصورت نہیں لیکن پیاس بجھنے کی خوشی میں ان میں جو چمک سی آ رہی ہے یہ ـــــ یہ ـــــ بس اب میں کیا کہوں' جیسے اندھیرے پورب پر پو پھٹ رہی ہے! اور یہ خمیدہ لبوں کے گوشوں کی پھڑکن اور یہ خوبصورت ناک کا سرخی مائل بانسہ اور یہ ـــــ یہ ـــــ!" وہ اور نہ سوچ سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ لڑکی کو گھور رہا ہے اور وہ اسے اچھا نہیں سمجھ رہی۔ اس کی نظریں پتھروں کی طرح گر گئیں اور وہ دو قدم آگے بڑھا کر بولا۔ "چھاگل منہ سے لگا لو۔"

"نہیں میں اوک سے پی لوں گی۔" لڑکی اوک بنا کر تھوڑی پر جما کر بولی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" شریف نے سوچا۔ چھاگل کا منہ کھول کر وہ اور آگے بڑھا اور ایک پتلی سی دھار گلابی اوک میں ابھرتے اور چھٹتے بلبلوں کا ایک

ننھا سا طوفان اٹھانے لگی۔ تیزی سے شریف نے لڑکی کے روشن ماتھے کی اس لکیر کو دیکھا جہاں سے اس کے بال شروع ہو رہے تھے اور ماتھے کے ابھار سے اس کی نگاہیں پھسلتی اس کے ابروؤں پر آ رکیں اور پھر لمبی پلکوں کے جال سے چھنتی پتلی ناک پر آ کر جم گئیں' یہاں سے اس نے دائیں بائیں اس کے ریشمی گالوں پر کانپتے ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھنے میں بہت دیر لگا دی۔ لال گالوں پر پانی کے قطرے بھی لال ہو رہے تھے' اور پھر اچانک شریف نے لڑکی کے خمیدہ ہونٹوں کو پانی میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ان ہونٹوں پر ـــــ ان نیم وا ہونٹوں پر ایک بار' بس ایک بار ـــــ صرف ایک پل کے لئے ـــــ آنکھ کی مختصر جھپکی کے وقفے کے لئے ـــــ بس ایکبار"

اور لڑکی چیخی۔ "تم نے تو سارا چہرہ بھگو دیا ـــــ تم کس سوچ میں ہو؟"

اور جب تک لڑکی بولتی رہی' چھاگل میں سے نکلتی ہوئی پانی کی دھار اسی طرح اس کی نامکمل اوک کے کنارے پر پڑتی رہی۔ اور پھر جب اچانک اس نے چھاگل کا منہ بند کر لیا' تو ننھے ننھے قطروں کی ایک پھوار سی لڑکی پر برس پڑی اور وہ آنکھ مل کر بولی۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں تو ٹھنڈ سے اکڑ جاؤں گی۔ ہوا بھی ٹھنڈی ہے' پانی بھی پی لیا ہے' کپڑے بھی بھیگ گئے ہیں" ـــــ اور شریف یہ الفاظ سننے کے بجائے اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھتا رہا ـــــ ایک بار ـــــ صرف ایک پل کے لئے ان ہونٹوں پر ـــــ!"

اس نے اپنے ڈھیلے ٹھنڈے ہونٹوں کو ملا۔ اس کے سینے میں بے شمار خیالات ہر طرف غبار اڑاتے ابھرے اور اس کے دماغ میں آ کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اس نے چاہا بڑھ کر ان گلابی ہونٹوں کو مس کر لے اور اس نے ایک قدم اٹھایا بھی! لیکن وہ رک گیا' لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی!

"کیا بات ہے؟" لڑکی نے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

شریف کی زبان پتھر بن گئی اور جب بڑی کوشش سے وہ اسے حرکت دینے میں کامیاب ہوا تو بولا۔ "یہ چھاگل تم لیتی جاؤ۔ تم پردیسی ہو' پانی کی تکلیف ہوتی ہو گی تمہیں۔ اب یہ آدھی بھری ہوئی ہے' کل گاؤں سے بھرتی لانا۔ دن بھر کام آئے گی۔ میں اور لے لوں گا۔ میرے پاس اور بہت سی چھاگلیں ہیں۔ لے لو——کوئی بات نہیں——لو——لے بھی لو۔"

اور سمٹتی ہوئی لڑکی کو چھاگل تھماتے وقت اس نے کوشش کی کہ اس کی انگلی کو اپنی انگلی سے چھو لے' لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا اور لڑکی مسکراتی ہوئی چلی' ڈھیری سے اتر کر کھیتوں میں سے گزرتی سامنے پہاڑیوں میں ایک پگڈنڈی پر سے ہوتی ایک موڑ مڑ کر غائب ہو گئی۔

شریف ہولے ہولے ڈھیری سے اترتا اسی چٹان کے پاس آیا۔ ایک بہت لمبی اور گہری سانس لے کر اس نے آنکھیں ملیں اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کا جسم جذبات کی شدت سے تپ کر کانپ رہا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ پیاس محسوس ہوتے ہی وہ آنکھیں جھپکانے لگا۔ تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ دور پگڈنڈی کے موڑ کو گھور کر وہ چٹان پر بیٹھ گیا اور تیز تیز سانسیں لینے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال اچھل اچھل کر پکارا۔ "پگلے تو اسے چھو تک بھی نہ سکا اور چھاگل بھی دے بیٹھا۔ شاید پانی کے لالچ سے وہ روز یہاں آتی۔ لیکن اب اسے چھاگل مل گئی ہے۔ وہ پہاڑوں کے پرے ہی رہے گی اور تو یہاں پیاس سے مرتا رہے گا۔ ارے یہی تو وہ چھاگل تھی جس میں فاطمہ تیرے لئے کھانڈ کا شربت بھر لائی تھی!——پگلا——بوڑھا کھوسٹ!"

شریف دماغ میں گونجتے ہوئے ان طوفانوں کی تاب نہ لا کر اٹھا اور ایک پتھر اٹھا کر چٹان سے بجانے لگا۔ ایک بار چند چنگاریاں نکلیں مگر فوراً" بجھ

گئیں——فوراً"!

اور شریف کے دماغ میں جیسے کوئی ادھ بھری چھاگل چھلکانے لگا!

——چھاگل——چھاگل——چھاگل!

☆